بدگمانیاں

کل افسانے

انیس ناگی

میں نے افسانہ شروع کرنے سے پہلے افسانے کا پس منظر بیان کر دیا ہے لیکن
پس منظر بیان کرنے سے کہانی افسانے میں منتقل نہیں ہوتی، افسانہ بنانا پڑتا ہے
اس لئے میں اپنے آپ کو اس بیان میں شامل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

میں نے اصل میں زندگی بھر کوئی کام نہیں کیا ... والد نے دو کوٹھیاں
وراثت میں چھوڑی تھیں۔ میں نے ایک کوٹھی بیچ کر ... فکسڈ ڈیپازٹ
میں جمع کرا دیئے ہیں

شکر ہے میری اولاد ... ت سے اپنے
میکے میں مقیم ہے۔ اس ... وہ کھاتے پیتے
لوگ ہیں اس لئے انہیں میر ...

میرا بیٹا اور اس کی بیوی ... ڈیپازٹ کو کنکھیوں سے
... دیتا ہے۔

... میرا بیٹا مجھے ...

... عف کی ... کرتا

میرے بیٹے نے میرا نا ... رکھا ہے۔

میں نے ایک پروفیسر دوست ... مطلب ...

... ایک روسی ناول ...

ناشر جمالیات
۲۲ گنگارام مینشن، مال روڈ، لاہور
طابع زاہد بشیر پرنٹرز ۵ لاہور
سال اشاعت 2001ء
قیمت: 180روپے

فہرست

سلیم شہزاد

انیس ناگی کی افسانہ نگاری

انیس ناگی کے افسانوں پر لکھنے کے لئے ضروری نہیں کہ بات ایک دفعہ پھر پریم چند سے شروع کی جائے کیونکہ اردو افسانے کی تاریخ کے اسے عہد پر کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یہ بات بھی ہماری ادبی تنقید اور تاریخ کا حصہ بن چکی ہے کہ اردو ریلسٹ افسانے کی معراج سعادت حسن منٹو کے افسانے تھے۔ عجب اتفاق ہے کہ اردو میں نئے افسانے کے تصور کا آغاز بھی منٹو سے ہوتا ہے۔ لیکن اس کی فارمولیشن ۱۹۶۰ کی نئے شاعری اور ادب کی تحریک کے زیر اثر ہوتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب نیا افسانہ' جدید افسانہ کی اصطلاحیں استعمال ہونے لگی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو افسانے میں کہانی کا عنصر غائب ہونے لگا تھا' نئے افسانہ نگاروں نے افسانہ کی بجائے اینٹی افسانہ لکھنے کی کوشش کی کہ پرانے افسانے کے سٹرکچر کو توڑ کر اسے اس طرح از سر نو منظم کیا جائے تاکہ زمانہ حال کی موقعیت ایک نئے اسلوب سے سامنے آئے۔ لیکن چند برسوں کے بعد اردو کے نئے افسانہ نویسوں میں اضمحلال کا شکار ہونے لگے۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ اس کی ایک وجہ اینٹی سٹوری تھی۔ یہ درست ہے کہ افسانہ میں کہانی کی مروجہ تثلیث کو خارج کرنے کے بعد نئے افسانہ نگار اس خلا کا پورا نہ کر سکے جس کے نتیجے کے طور پر ان کے افسانے بے ربط خود کلامیوں تک محدود ہو گئے۔ نئے افسانے کی

پسپائی کی دوسری وجہ نئے افسانہ نویسوں کا اپنے عہد سے گریز تھا۔ بہت سے نئے افسانہ نویسوں نے چپ سادھ لی۔ بقول انیس ناگی "۱۹۹۰ تک پہنچتے پہنچتے نئے اردو افسانے نے دم توڑ دیا تھا"۔ چنانچہ ہوا یہ کہ نیا اردو افسانہ نیا فریمیٹ بناتے بناتے رہ گیا' اس لئے نئے اردو افسانے کو ادھورا افسانہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

نئے اردو افسانے کے اس تناظر میں انیس ناگی نے خود افسانے لکھنے کی بجائے پہلے نئے افسانے کی تصوراتی فارمولیشن کی اور مغرب کے ان افسانہ نویسوں کی تکنیکوں کا بھی سیر حاصل جائزہ لیا جنہوں نے نئے اردو افسانے کو متاثر کیا تھا۔ پاکستان میں نئے افسانے پر سب سے زیادہ انیس ناگی نے لکھا ہے اور اس کے تنقیدی مجموعوں میں دس کے قریب مضامین نئے اردو افسانے کو بحث میں لاتے ہیں۔ انیس ناگی کی اس تنقید کو اس کے اپنے افسانوں کی پیش بندی بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ اس خیال کا حامل ہے کہ افسانہ ایک tension کی صورتحال ہوتی ہے جسے دریافت کیا جاتا ہے۔ وہ کہانی اور افسانے میں فرق قائم کرتا ہے کہ کہانی کو فن کے ذریعے افسانہ بنایا جاتا ہے۔ افسانے کے لئے کسی فارمل سٹرکچر کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر افسانہ اپنا لسانی لہجہ خود مخترع کرتا ہے۔ وہ لسانی طوطا مینا بنانے کے حق میں نہیں ہے جسے بعض افسانہ نویس لسانی تجربات سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ کہانی کی تثلیث کو قبول نہیں کرتا۔ وہ لکھتا ہے کہ افسانہ کہیں سے بھی شروع ہو سکتا ہے اور بغیر ختم کئے ہوئے بھی ختم ہو سکتا ہے۔ افسانے کی بنیاد واقعہ کی بجائے واقعہ کے تصور پر ہونی چاہئے۔ انیس ناگی کے فکشن پر تصورات اس کے تنقیدی نظام کا حصہ ہیں' وہ واحد نقاد ہے جس نے جدیدیت پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور اس کے لئے ہمعصریت ایک لازمی شرط قرار دیتا ہے۔

انیس ناگی کا افسانہ نگاری کے میدان میں سفر عمودی ہے۔ شروع میں اس کے افسانوں کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی کیونکہ نقاد اور قارئین اس کی

دوسری ادبی مہمات کی طرف متوجہ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کی اس نے نسبتاً کم افسانے لکھے ہیں اور وہ بھی وقفوں کے ساتھ۔ اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "حکایات" ۱۹۸۰ کے لگ بھگ شائع ہوا جس میں اس کی سات حکایات اور تین تمثیلیں شامل ہیں۔ "حکایات" کے بعد اس کا دوسرا افسانوی مجموعہ "گردش" بھی ۱۹۸۰ کی دہائی میں شائع ہوا جس میں اس نے حکایات کے ساتھ نئی افسانوں کا اضافہ کیا۔ اس نے اپنے کل افسانے ۱۹۹۴ میں "وقت کی کہانیاں" کے عنوان سے شائع کئے۔ اب ۲۰۰۱ میں اس نے اپنے ۲۶ افسانے "بدگمانیاں" کے عنوان سے ایک جلد میں مرتب کئے ہیں۔ وہ انہیں اپنے کل افسانے کہتا ہے۔ بدگمانیاں بڑا Intriguing عنوان ہے۔ ان افسانوں میں اپنے اور معاشرے کے وجود پر بے یقینی اور بدگمانی کا گہرا احساس ملتا ہے۔ یہ دراصل lack of Faith ہے۔ اس اعتبار سے انیس ناگی کے افسانے ایک معروضی صورتحال سے پیدا ہو کر ایک بہت بڑی nehilistic داخلیت کو جنم دیتے ہیں۔ احساس کی یہ رو جس تصوراتی شکل کو پیدا کرتی ہے وہ فلسفیانہ ہے او انسانی وجود کی متھ کو پارہ پارہ کر کے اسے الوہیت سے محروم کر دیتی ہے۔ انسان کا وجود خود انسانی نظام کے ہاتھوں ردی کاغذ کا ایک ٹکڑا بن جاتا ہے جو ہوا کے ہچکولے سے ادھر ادھر ڈگمگاتا پھرتا ہے۔ چنانچہ اس طرح انیس ناگی کے افسانوں میں عہد حاضر کا انسان ایک ایسی سوشل ریئلیٹی کے طور پر نمودار ہوتا ہے جو ایک سائیکولوجیکل ریئلیٹی بھی ہے اور اپنی تاریخ کی اسیر ہے' اس لئے اس کی انفرادی آزادی پہلے سے ہی سلب ہو چکی ہے جس کی بازیابی کے لئے وہ کوشش کرتا ہے لیکن اس کی کوشش شاہ سیسفس کے بار بار پتھر اٹھانے کی مانند ہے۔ تشکیک انیس ناگی کے افسانوں کا اہم جزو ہے' اسی طرح نفسیاتی الجھن' اکتاہٹ' بیزاری' مادرائیت کی خواہش' خود کلامی اور لاتعلقی اس کے افسانوں اور کرداروں کو ایک نئی معنویت دیتے ہیں۔ انیس ناگی کا

انسان ولیم گولڈنگ کے انسان کی طرح اندر سے سیاہ نہیں ہے' وہ کوئی درندہ نہیں ہے بلکہ اجتماعی بے حسی کی وبا سے متاثر ایک فرد ہے جو خارج سے اس میں در آئی ہے۔

انیس ناگی کی فکشن میں اس کی سات حکایات اور تین تمثیلیں غیر معمولی حیثیت کی مالک ہیں۔ اس کی سات حکایات ایک کی فرد حامد کے سات دنوں کی داستان ہے' یہ آپس میں مربوط ہیں اور انہیں باہم ملا کر ایک ناولٹ کی شکل بنتی ہے۔ انیس ناگی کا فنی کمال یہ ہے کہ اس نے نہایت ہی subjective حکایات کے معروضی علاؤق اس طرح بنائے ہیں کہ یہ بیک وقت داخلیت اور خارجیت میں سفر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور ان کی معنوی سطح متغیر ہوتی رہتی ہے۔ حکایات کا فارمیٹ انیس ناگی کے دوسرے افسانوں سے مختلف ہے' وہ پلاٹ کی بجائے ایک مرکزی تمیم پر کہانی کا تانابانا مرتب کرتا ہے' غیر ضروری جزئیات سے گریز کرتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر یہ بیحد چست کہانیاں ہیں جن میں انیس ناگی ہر وقت خود موجود رہتا ہے۔ اس کے کردار سٹیرو ٹائیپ نہیں ہیں' اس نے اپنی سرکاری زندگی' اپنی نجی زندگی عصری زندگی کے فریم میں جوڑا ہے۔ اس کے اپنے کردار سے بہت سے کردار نکلتے ہیں جو آزادی کے خواہاں ہیں لیکن ان کی زبانیں گنگ ہیں' ان کے ہاتھ شور مچاتے ہیں لیکن مصلحت اور خوف نے ان ہاتھوں کو سرکاری رسیوں سے جکڑ رکھا ہے۔ اس کے کردار نفسیاتی طور پر خوف زدہ ہیں' کوشش کے باوجود وہ یقین کی منزل نہیں پاتے۔ وہ بغاوت کرنا چاہتے ہیں لیکن عمل سے محروم ہیں۔ ان کی سوچ اور عمل میں بعد ان کو لایعنی بنا دیتا ہے۔ "حکایات" کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ اس نے یہ objectlanguage میں لکھی ہیں۔ یعنی لفظ کو اس کے بنیادی معنی میں استعمال کیا گیا ہے تا کہ اس کی معنویت متعین کی جا سکے۔ انیس ناگی کے اس دعوی کے باوجود حکایات کا لسانی

شیوہ کثیر المعانی ہے۔ اس میں ہمیں ایک جیتا جاگتا معاصر پاکستانی معاشرہ دکھائی دیتا ہے۔ یوں تو سات حکایات میں ہر ایک حکایت ایک الگ شناخت رکھتی ہیں۔ لیکن یہ سب زمانی ترتیب سے ایک بن جاتی ہیں۔ اس کی تمثیلوں کے کردار نیکی اور بدی کے عام کردار ہونے کے باوجود منفرد شناخت رکھتے ہیں کیونکہ ان کی بدی احساس کی بدی ہے۔ اس کے ہاں اجتماعی نیکی کا تصور شدید ہے۔

انیس ناگی ایک وسیع المطالعہ ادیب ہے جو خاص طور پر بین الاقوامی ادب پر گہری نظر رکھتا ہے۔ دوستوفسکی سے لے کر کامیو' سارتر' کامیو الان راب گرئیے ایسے جید فکشن نگاروں کے گنت آثار بھی کہیں کہیں اس کے افسانوں میں ملتے ہیں لیکن وہ اس کے تخلیقی شعور میں ڈھل کر فکشن میں ایک ایسا اسلوب پیدا کرتے ہیں جو ابھی تک معاصر افسانہ نگاروں کی دسترس سے دور ہے۔

انیس ناگی کی افسانہ نگاری کا اسلوب معاصر افسانہ نویسوں سے بہت مختلف ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ ۱۹۶۰ کی نئے افسانہ کے رجحان سے بھی متاثر نہیں ہے۔ اس کا مغربی ادب کا مطالعہ خوفناک حد تک وسیع ہے۔ اس کے افسانوں کا مواد اس ملک کی سرزمین کے بحران سے جنم لیتا ہے۔ اس کے افسانوں میں افسانہ لکھنے بے شمار تکنیکیں موجود ہیں۔ اس کی نئے اردو افسانے میں contribution شعور کی آزاد رو کا ماہرانہ استعمال' مونتاج کی تکنیک' بیانیہ اور خود کلامی کا امتزاج' افسانے کی بنیاد واقعہ کی بجائے تصور پر رکھنا اور سب سے بڑھ کر لہجے کی زبان میں لکھتا ہے۔

انکل ڈک کی موت

یہ محض ایک حادثہ تھا، وہ صبح صبح حجامت کرانے کے لئے گھر سے باہر نکلا، وہ سڑک عبور کر رہا تھا کہ ایک کار بھاگتی ہوئی اور اسے نیچے گرا کر فراٹے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ راہگیروں نے اسے ہسپتال داخل کرا دیا۔ اس کی جیب سے ایک خط نکلا جس پر اس کا پتہ درج تھا۔

اس کی موت کی اطلاع ملتے ہی اس کی بیوی آنٹی ڈک کا سب کچھ اجڑ گیا ہے۔ وہ اس سرزمین پر بالکل اکیلی ہے، اس کے غم میں دل و جان سے شریک ہونے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنے دو کمروں کے خستہ سے فلیٹ میں چند محلّہ دار عورتوں کے ساتھ ڈی سوزا کے تابوت کے پاس کھڑی ہے، وہ اسے پیار سے انکل ڈک کہا کرتی تھی اور کبھی پاپا، تابوت کا ڈھکنا کھلا ہے، وہ ڈوب ڈوب کر سسکیاں لے رہی ہے، ہمسایہ عورتوں کے چہرے سپاٹ ہیں۔ ان کی موجودگی محض محلے داری کا پاس ہے۔

آنٹی ڈک کا گوشت جھلی کی طرح اس کے بدن کے ساتھ لٹکا ہوا ہے، اس خستگی کے باوجود اس کا چہرہ روژ سے سرخ ہے اور معمول کے مطابق اس نے اپنے بالوں کو رنگا ہوا ہے، اس کے کانوں سے سفید پلاسٹک کے بندے ہیں۔ اس کی واحد اولاد زونی اس کے پاس کھڑی ہے = اس کے چہرے پر غم کی لکیریں

نمایاں ہیں لیکن ان میں وہ کرب نہیں ہے جو آنٹی ڈک کے وجود سے رباہر نکل رہا ہے۔۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کی گود سے نکل کر کافی عرصہ پہلے دوسرے خاندان میں جا چکی ہے۔ اس حادثے کے بعد جب ڈک کے ہمسایہ اخبار نویس نے آنٹی ڈک کو بالکل تنہا پایا تو اس نے ٹارنٹو ٹیلیفون کیا کہ ڈک کی حالت نازک تھی' حالانکہ ڈک تو مر چکا تھا۔۔ وہ دو دنوں کے بعد اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ اس سوگ میں شریک ہونے کے لئے آ گئی ہے۔ اس کا خاوند برائن ہونک قسم کا چاکلیٹ رنگ کا عیسائی ہے جس نے زونی کے سڈول اور جاذب بدن پر کافی محنت کر کے تین بچے بنائے ہیں۔ زونی اب ایک ڈھلتی ہوئی عورت ہے۔ اگر اس کی عمر کا کوئی محلہ دار اسے دیکھ لے تو شاید پہچان نہ پاوے۔ زونی حیران آنکھوں سے ادہر ادہر دیکھ رہی ہے جیسے وہ بھولی ہوئی چیزوں اور شکلوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کی زندگی کا معمول بھی عجیب تھا۔ وہ صرف انکل ڈک کے ساتھ بازو میں بازو ڈال کر گھر سے باہر نکلتی تھی۔ محلہ والوں نے باپ بیٹی پر شک کرتے تھے مگر انکل ڈک کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ اس کی محلہ میں کسی سے کوئی بات چیت نہیں تھی۔ وہ عیسائی تھا اور مسلمانوں کے محلے میں رہتا تھا۔ اس کی صرف ایک دو سے ہائے بائے تھی۔ انکل ڈک ایک کار کی کمپنی میں سیلز کے شعبے میں کام کیا کرتا تھا۔ ہفتے کی شام کو ایک دو بوڑھے عیسائی جوڑے اس کے فلیٹ پر آتے اور برآمدے میں وہسکی پیتے' اہل محلہ پاس سے گزرتے ہوئے انہیں چور آنکھوں سے دیکھتے۔ اس کا کوئی مقامی باشندہ دوست نہیں تھا۔ اس کے ملاقاتیوں میں ایک بوڑھا سا اینگلو انڈین بھی تھا جو غالبا کسی زمانے میں ٹریفک سارجنٹ تھا اور اپنے ماضی کا ایک نشان تھا۔ اس زمانے میں ٹریفک کے تمام سارجنٹ اینگلو انڈین ہوتے تھے اور ان کا کافی رعب ہوتا' وہ کلف کی طرح اکڑے ہوئے آدھی انگریزی اور آدھی اردو بولتے تھے۔

ٹریفک کی خلاف ورزی کرنے والے انہیں دیکھ کر بھاگ جاتے کہ صاحب ایک دم اندر کر دیتے تھے اور کسی قسم کی رعایت نہیں برتتے تھے۔ ان کی ایک اپنی چھوٹی سی کالونی تھی' ان کی سفید اور سانولی بیویاں سکرٹ پہنتیں اور بڑی بن ٹھن کر باہر نکلتیں' لوگ انہیں حیرت اور حسرت سے دیکھا کرتے تھے۔ انکل ڈک کی موت تک پہنچتے پہنچتے یہ برانڈ شہر میں ختم ہو چکا تھا اور اب ان کی جگہ کوئی اینگلو پاکستانی نہیں تھا۔

زونی پلاسٹک میں بند پھولوں کا ایک گلدستہ ڈک کے سینے پر رکھ کر سامنے ایک میلی سی دیوار کو گھورنے لگی ہے۔ ڈک کے تابوت کے پاس کھڑی عورتوں میں فلیٹوں میں رہنے والی دو بوڑھی عورتیں زونی کو پہچانتی ہیں۔ وہ عورتیں جو کواٹروں میں رہتی ہیں وہ اسے نہیں پہچانتیں کیونکہ زونی کی ہم عمر لڑکیوں کی مدت مدید سے شادی ہو چکی ہے اور ان کی جگہ ایک نئی نسل نے لے لی ہے۔۔ ان مشت بھر عورتوں کا تعزیت کے لئے آنا کچھ غیر معمولی سی بات ہے۔ اگر محلے داری کا معاملہ تھا تو پھر سب مردوں اور عورتوں کو آنا چاہیے لیکن بہت کم لوگ آئے ہیں۔ یہ کہنا بیجا نہیں کہ اس میں قصور انکل ڈک کا بھی تھا جو لوگوں سے نہیں ملتا تھا' کسی بھی شخص سے اس کا ذاتی تعلق نہیں تھا۔ انکل ڈک کو اس سے کیا کہ کوئی آتا ہے یا نہیں' وہ تو مر چکا ہے اور مسائل کا ایک ڈھیر اپنی بیوی کے لئے چھوڑ گیا ہے۔ عجب اتفاق ہے کہ اس محلے میں اتنی طویل مدت رہنے کے باوجود کسی کو اس کی بیوی کا نام پتہ معلوم نہیں ہے۔۔ یوں تو انکل ڈک کے بارے میں بھی کسی کو کچھ پتہ نہیں ہے۔ بس اتنا ضرور معلوم ہے کہ وہ لکھنؤ کا رہنے والا تھا اور دوسری جنگ عظیم میں سارجنٹ تھا اور انڈونیشا کی ایک عورت سے اس نے شادی کی تھی۔ کیا وہ دوسری جنگ میں انڈونیشیا گیا تھا یا وہ اسے ہندوستان میں ملی تھی اس بارے میں بھی کسی کو کچھ معلوم نہیں

ہے۔ایک دو مرتبہ انڈونیشیا سے اس عورت کے بھائی اسے ملنے ضرور آئے تھے

انکل ڈک دبلا پتلا آدمی تھا جو اپنی مضبوط تن بیوی کو کبھی کبھی چھڑی سے مارا کرتا اور اس کے چیخنے کی آواز باہر گلی میں بھی سنائی دیا کرتی۔انکل ڈک بے حس وحرکت تابوت میں اپنا عروسی کا خستہ لباس پہنے لیٹا ہوا ہے' وہ شاید انتظار میں ہے کہ اسے خاک کے سپرد کیا جائے۔اس کے تابوت کا ڈھکنا دیوار کے ساتھ کھڑا ہے اس پر بھی صلیب کا نشان بنا ہوا ہے۔بس اب انتظار اس بات کا ہے کہ ایمبولنس جلدی پہنچ جائے اور سوگواری کا یہ منظر کسی انجام کو پہنچے۔کوارٹروں میں رہنے والے دو لڑکے ایمبولنس لینے گئے ہوئے ہیں۔ان لڑکوں کی مستعدی بڑی غیر معمولی سی بات ہے۔کیونکہ راہ جاتے لڑکے انکل ڈک کے بلڈاگ کو کنکر مارتے تھے اور وہ انہیں گالیاں دیا کرتا تھا۔کچھ سال پہلے انکل ڈک کی بیحد پرانی ٹیوٹا کار اس کے فلیٹ کے باہر سے چوری ہو گئی تھی' اس نے غصے میں ایک دو لڑکوں کے نام پولیس کو دیئے تھے جو کار کیننگ کا کام کرتے تھے' ان لڑکوں نے پولیس کو پیسے دیئے اور ہنستے کھیلتے باہر آگئے تھے۔اس چوری کے بعد انکل ڈک نے اس سے بھی زیادہ پرانی زرد رنگ کی مزدا کار خرید لی تھی جسے وہ ہر روز صبح خود صاف کرتا اور سارا دن کار کھڑی رہتی اور وہ اس کو کبھی کبھی چلایا کرتا تھا۔گزشتہ پانچ سالوں سے انکل ڈک کے معمولات میں ایک تبدیلی کو سب نے محسوس کیا تھا۔صبح صبح اس کے فلیٹ کے باہر روزانہ تین چار عمر رسیدہ چادریں اوڑھ کر انکل ڈک کا انتظار کرتے رہتے' وہ دس بجے باہر نکلتا اور برآمدے میں کھڑا ہو کر ان دیہاتیوں سے بات چیت کرتا اور ان کی درخواستیں لے کر رکھ لیتا۔ایک مرتبہ محلے کے ایک لڑکے نے ایک بوڑھے سے اس محلے میں آنے کی وجہ پوچھی' بوڑھے نے لرزتی ہوئی آواز میں بتایا کہ وہ برٹش آرمی کا

صوبیدار ہے دوسری جنگ میں وہ برما کے محاذ پر لڑا تھا اور تین مہینے جاپانیوں کی قید میں بھی رہا تھا۔وہ یہاں ڈی سوزا صاحب سے تصدیق کرانے آتا ہے کہ وہ برٹش فوجی تھا' اسے پنشن ملتی ہے۔محلے کا لڑکا کچھ پڑھا لکھا تھا اس نے کہا

"بابا جنگ ۱۹۴۶ میں ختم ہو گئی تھی۔

"ہاں." بزرگ نے جواب دیا" میں انگریز کی فوج کا صوبیدار ہوں اور انگریز اپنے وفاداروں کا ہمیشہ دھیان رکھتا ہے

۔یوں لگتا تھا کہ کاروں کی کمپنی سے ریٹائر ہونے کے بعد سابق فوجیوں کی درخواستوں کی تصدیق انکل ڈک کی واحد مصروفیت تھی۔انکل ڈک کے تابوت کے سرہانے ایک پرانی سی الماری ہے جس میں بہت سی فائلیں ٹھسی ہوئی ہیں' غالباً یہ پرانے فوجیوں کا ریکارڈ ہے۔جب تک زونی اس کے ساتھ رہتی تھی اس کا گھر صاف ستھرا تھا لیکن اب یہ کافی بوسیدہ ہو چکا ہے' صوفے پھٹے ہوئے ہیں' چادریں میلی ہیں اور سارا فرنیچر فرسودہ ہے۔۔یوں معلوم ہوتا ہے کہ بڑھاپے نے انکل ڈک سے زندگی کی خواہش چھین لی تھی' اس کا ایک بے حد بوڑھا خانساماں' جو خود ایک عیسائی تھا' ان میاں بیوی کا کھانا پکاتا' تھا.وہ ہمیشہ غیر مطمئن رہتا اور نوکری چھوڑنے کی دھمکی دیتا رہتا۔وہ بھی آخر چلا گیا' نہ معلوم یہ دونوں بوڑھے میاں بیوی کس طرح کھانا پکاتے تھے۔

فلیٹ کے باہر کچھ بوڑھے اور چڑ مڑ سفید سروں والے چار محلے دار ایمبولنس کے منتظر ہیں اور کچھ بیتاب بھی ہیں کہ چھٹی کا دن ضائع جا رہا ہے۔وہ ایک دوسرے کو اپنی مصروفیات کی فہرست سنا رہے ہیں۔وہ تینوں اپنی زندگی ہنڈا چکے ہیں لیکن ان کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ اپنے ماضی اور حال سے مطمئن نہیں ہیں' وہ بہت کچھ چاہتے ہیں جو وہ حاصل نہیں کر سکتے۔ان میں سے ایک فیصل آباد کا دیہاتی ہے.لمبا سکڑا سا عمر رسیدہ ہے جو نہ جانے اس شہر میں کیا کرنے آیا

ہے' وہ انکل ڈک کے فلیٹ کے اوپر پہلی منزل پر واقع فلیٹ میں رہتا ہے۔ ان فلیٹوں کی ایک خصوصیت ان کی یکسانیت ہے' کسی ایک فلیٹ میں چڑھ جائیں سب ہو بہو ایک جیسے لگتے ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے ان کا مالک ایک ہندو تھا جو رفاہ عامہ کے کاموں کے لئے مشہور تھا جس فلیٹ میں یہ شہری نما دیہاتی رہتا ہے اس میں کسی زمانے میں ایک مشہور مصورہ امرتا شیر گل نے جان دی تھی۔ اس آبادی میں رہنے والوں میں کسی ایک کو علم نہیں ہے کہ یہاں ایک نامور فنکارہ رہتی تھی۔ اس کے بارے میں پرانے شہریوں کو کچھ یاد ہے۔ اس کا باپ ایک سکھ جاگیردار تھا جس نے ہنگری کی ایک عورت سے شادی کر لی تھی' اور اس نے زندگی کا کافی حصہ یورپ میں بسر کیا تھا۔ امرتا شیر گل نے بھی اپنی مصوری کی ابتدائی تربیت پیرس کے سٹوڈیوز میں حاصل کی تھی۔ امرتا کی شادی اس کی ماں کے ایک کزن سے ہوئی تھی جو سرجن تھا اور اس نے اپنی عمر کا آخری برس اسی فلیٹ میں بسر کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ امرتا بڑی فراخ دل عورت تھی اور بہت سے نوجوانوں سے اس کا تعلق تھا' اس کا خاوند یہ بات پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ جب اس فلیٹ میں آئی تو حاملہ تھی۔ ایک دن اچانک اس کی طبیعت خراب ہوئی اور وہ مر گئی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کے خاوند نے حسد میں اسے زہر دے دیا تھا۔ ہو سکتا ہے ان فلیٹوں میں اس قسم کی اور کہانیاں بھی ہوں لیکن یہاں کے موجودہ رہنے والے نچلے متوسط طبقے کے لوگ ہیں جنہیں صرف دولت کمانے سے غرض ہے اور ایک دوسرے سے تعلق بھی محض اتفاقی ہے۔ اگر ان میں یگانگت ہوتی تو انکل ڈک کے جنازے پر یہ بے سروسامانی نہ ہوتی۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ چار پانچ عورتیں اور پانچ چھ آدمی موجود ہیں' حیرت کی بات ہے کہ اس کے کینیڈا سے آئے ہوئے داماد کے علاوہ شہر کا کوئی عیسائی موجود نہیں ہے۔ جنازے میں شریک مرد عورتیں ایمبولنس کے انتظار میں مضطرب

ہوتے جا رہے ہیں۔ تابوت کے پاس بیٹھی کواٹروں میں رہنے والی ایک معمر عورت اپنی ساتھی عورت کو یہ کہہ کر اٹھ گئی ہے کہ اس نے دوپہر کی ہنڈیا پکانی ہے بہت دیر ہو گئی ہے۔ اس کے پاس بیٹھی ہوئی عورت بھی اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اب کمرے میں کل چار عورتیں رہ گئی ہیں۔ گلی میں کھڑے سفید بالوں اور سکڑے ہوئے چہروں والے محلہ داروں میں سے ایک نے کہا ہے

"دیکھو جی کواٹر میں رہنے والے لڑکوں نے کمال کر دیا ہے۔ انکل ڈک کی تیمارداری میں صبح شام ایک کر دی تھی۔ ایک لڑکا صبح ہسپتال میں رہتا تھا اور دوسرا رات کو انکل ڈک کی بیوی کو رکشے میں سوار کر کے ہسپتال لے جاتا تھا' کھانا پہنچاتا تھا' بیچاری بوڑھی اکیلی عورت تھی' اتنی دور ہسپتال میں کیسے جاتی؟" بوڑھوں کی ٹلیث خاموش ہو گئی ہے اس لئے تینوں ایک ہی لگتے ہیں' ان کی آوازیں انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرتی ہیں۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد ایک نے کہا ہے۔

"آجکل کون کسی کا ہے؟ آپ کو پتہ ہے کہ محلے کہ یہ لڑکے ڈک کی خدمت کیوں کر رہے تھے؟" ۔ فیصل آباد کے شہری نما دیہاتی نے یک لخت کہا ہے ۔ "سارا مسئلہ فلیٹ کا ہے' اس کی پگڑی چھ لاکھ روپیہ ہے کمرشل علاقے میں واقع ہے۔" بوڑھوں کی ٹلیث کے دو گوشے خاموش ہیں' تیسرے گوشے پر کھڑا فیصل آبادی قدرے جوش میں آ گیا ہے۔

"جناب دنیا اسی طرح چلتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ان لڑکوں کے باپ' جن میں سے ایک کار ڈیلر ہے اور کافی امیر ہے' اس کی یہ چال تھی' وہ ڈک کی بیوی کا دل موہ رہا تھا اسی لئے اس کا بیٹا صبح و شام اس کی بیوی کا ساتھ دیتا تھا۔ دوسرے بوڑھے نے تبصرہ کیا ہے"

"تو پھر ابھی تک آنٹی ڈک نے فلیٹ کا سودا کیوں نہیں کیا؟" تینوں میں سے

ایک بوڑھے نے سوال کیا ہے۔

"بھائی صاحب اس کا تابوت تو اٹھنے دو۔" بوڑھے اخبار نویس نے بھولے پن سے کہا ہے۔

"واہ میاں جی فلیٹ کی کس کو ضرورت نہیں ہے"۔ تیسرے نے اپنے سفید لمبے لمبے بال سہلاتے ہوئے کہا ہے"۔

"بھائی صاحب ڈک کی بیوی انڈونیشیا کی رہنے والی ہے' بیٹی کینیڈا میں رہتی ہے . وہ یہاں اکیلی رہ کر کیا کرے گی؟

"اچھا اسی لئے ہمسائے کی خدمت ہو رہی ہے' میں نے بھی سنا ہے کہ ڈک کی بیوی جس کو قبضہ دے گی وہی اس فلیٹ کو الاٹ کرالے گا . صاف بات تو یہ ہے کہ ہمسائے کا حق اول ہوتا ہے . میں بھی تو اس کا سب سے قریبی ہمسایہ ہوں۔ فیصل آبادی بوڑھے نے کہا ہے۔"

"ایمبولنس لینے کون گیا ہے؟" بوڑھے صحافی نے تھکن سے کہا ہے اور اپنی گھڑی پر وقت دیکھا ہے۔

"وہی ڈیلر کا بیٹا . دیکھیں ڈک کی بیوی انڈونیشیا جاتی ہے یا کینیڈا؟"۔ تیسرے نامعلوم آدمی نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا ہے۔

"بات یہ کہ یہاں کے رہنے والوں کے کنبے بڑے ہوگئے ہیں اور جگہ تنگ ہے' یہاں سارا دن شور اور بینک کی نوٹ جلانے والی بھٹیوں کا دھواں اڑتا ہے لیکن اس کے باوجود یہاں سے کوئی جانے کے لئے تیار نہیں ہے"

" کیوں جائیں . ان فلیٹوں کی پگڑی لاکھوں میں ہے اور ان کا کرایہ بھی برائے نام ہے . دیکھیں ڈک کی بیوی کس کو فلیٹ دیتی ہے' اس نے جب یہاں سے چلے ہی جانا ہے وہ پیسہ دھیلا لے کر کیا کرے گی؟" اخبار نویس نے اپنی ڈھیلی سی آواز میں کہا ہے۔

"میرا نہیں خیال کہ وہ یہاں زیادہ دیر رہے گی"۔ سامنے کی طرف سے ایک نیلے رنگ کا سوزوکی ڈبہ رکا ہے جسے ایمبولنس میں تبدیل کیا گیا ہے' اس میں سے محلے کے دو لڑکے بڑی تیزی سے اترے ہیں۔

"ایمبولنس آگئی ہے"۔ کسی نے کہا ہے۔ یہ آواز نہ جانے کس طرح ڈک کے فلیٹ میں پہنچ گئی ہے اور کسی تاخیر کے بغیر ڈک کے تابوت کو ایمبولنس میں رکھا جا رہا ہے۔ کسی کی آنکھ نم نہیں ہے' صرف ڈک کی بیوی غم سے نڈھال بلند آواز میں رو رہی ہے۔

"ڈک میں تمہارے بغیر یہاں کیسے رہوں گی؟ تمہارے کتے کو کون سیر کرائے گا' تمہارے لوبرڈز پیاسے مر جائیں گے"۔ ڈک کی بیوی فرط غم میں اوٹ پٹانگ باتیں کر رہی ہے۔ وہ تینوں بوڑھے مسکرا رہے ہیں۔

"دیکھا میں نے کہا تھا کہ وہ ڈک کے بغیر یہاں نہیں رہے گی"۔ فیصل آبادی بوڑھے نے عیاری سے مسکراتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا ہے۔ سوگ منانے والوں میں سے ڈک کا داماد' اس کی بیوی اور محلے کے دو لڑکے ایمبولنس میں سوار ہوگئے ہیں جسے رسوم کی ادائیگی کے لئے رومن کیتھولک چرچ لے جانا ہے۔

کینیڈا جانے سے پہلے زونی نے اپنی ماں کو بیحد مجبور کیا کہ وہ اس کے ساتھ چلے لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے انڈونیشیا میں اپنے ماموں کو ٹیلیفون کیا جس نے بمشکل اسے پہچانا لیکن اس کا خیال تھا کہ اتنی طویل مدت ملک سے باہر رہنے کے بعد اس کا یہاں جی نہیں لگے گا۔ زونی کے خاوند کی چھٹی ختم ہوگئی ہے' اس لئے اسے واپس جانا ہی ہے۔ ایک مہینہ گزر چکا ہے لیکن ڈک کی بیوی نے کوئی فیصلہ نہیں کیا' فیصل آباد کے دیہاتی نے اس سے عارضی طور پر ایک کمرہ مانگا ہے کہ اس کا بیٹا باہر سے آ رہا ہے لیکن اس نے

کوئی جواب نہیں دیا۔ یہی فرمائش کار ڈیلر نے کی لیکن آنٹی ڈک نے اسے بھی کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ محلے کے لڑکے جو صبح وشام ڈک کی تیمارداری کرتے تھے وہ بھی غائب ہوگئے ہیں۔ ڈک کی بیوی برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹی کراہتی ہے، سامنے کے فلیٹ میں سے بوڑھے اخبار نویس کی بیوی اسے دو وقت کا کھانا بھیج دیتی ہے۔ کواٹروں میں اور فلیٹوں میں رہنے والے سامنے سڑک سے گزرتے ہوئے چور نگاہوں سے ڈک کی بیوی کو دیکھتے ہیں کہ اس کا سانس کب بند ہوتا ہے یا وہ کب انڈونیشیا جاتی ہے، ابھی تک معاملات اسی طرح ہیں اور محلے والے انتظار میں ہیں۔

پس نوشت

اس محلے کے لوگوں نے یکایک محسوس کیا کہ دو تین دنوں سے آنٹی ڈک باہر برآمدے میں اپنی آرام کرسی پر دراز نہیں ہے، اور انکل ڈک کا کتا نیم بیہوشی کے عالم میں برآمدے کے فرش پر کراہ رہا ہے۔ فیصل آبادی بوڑھے کو زیادہ تشویش ہوئی، اس نے برآمدے سے کمرے میں داخل ہونے والے دروازے کے باہر لگے جالی دار دروازے کو کھولنا چاہا تو انکل ڈک کے کتے نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ دروازے پر ایک موٹا سا قفل لگا ہوا تھا، اس نے کچھ دیر کے لئے سوچا پھر جلدی سے اپنے فلیٹ کی گھنٹی دبائی، بالکونی سے اس کی موٹی سیاہ رنگ کی بیوی نے جھانک کر دیکھا، فیصل آبادی بوڑھے نے اضطراب میں کہا کہ وہ چلی گئی ہے۔ اس کے بعد وہ باری باری اپنے دو ہم عمر محلے داروں کے پاس گیا اور آنٹی ڈک کی غیر موجودگی کے بارے میں پوچھا، دونوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ اخبار نویس کی بیوی، جو آنٹی ڈک کے قدرے قریب تھی بھونچکی رہ گئی۔۔

غیر ملکی ہوتے ہی کمینے ہیں، صرف مطلب نکالتے ہیں، میں نے بیس دنوں تک اسے دو وقت کا کھانا بھیجا، میرے لڑکے کی شادی ہونے والی ہے، میں نے مہمانوں کو اس کے فلیٹ میں رکھنا تھا، اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، بذات عورت نکلی۔

آنٹی ڈک کی پراسرار گمشدگی کی خبر محلے میں آگ کی طرح پھیل گئی ہے، محلے کے رہنے والے باری باری اس کے فلیٹ میں لگے تالے کو اوپر نیچے کرکے دیکھتے ہیں، ڈک کا کتا خاموش رہتا ہے۔

"بڈھی چڑیل جانے سے پہلے کم سے کم اپنے کتے کو تو رہا کر جاتی۔"

انکل ڈک کے سارے لو برڈز مر چکے ہیں اور ایک لڑکا اس کا بڑا سا پنجرہ اٹھا کر اپنے کواٹر کی طرف یہ کہتے ہوئے لے گیا ہے۔۔

"بے زبان خوامخواہ مرگئے ہیں۔"

جب سب کو یقین ہوگیا کہ آنٹی ڈک لاپتہ ہوگئی ہے تو محلے کے ہر رہائشی نے اس خالی لیکن مقفل فلیٹ کی الاٹمنٹ کے لئے درخواست دی۔ ایک دن تین کاریں آئی ان میں سے مشٹنڈے قسم کے ہر عمر کے چھ سات آدمی نکلے، انہوں نے انکل ڈک کے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر جاکر اس کا جائزہ لینے لگے۔ اس دوران سارا محلہ فلیٹ کے باہر جمع ہوگیا۔ ان میں سے ایک نے جو سیاسی قسم کا آدمی تھا اس نے بلند آواز میں، لوگوں کو سنانے کے لئے کہا کہ اس نے آنٹی ڈک سے پچاس ہزار روپے میں قبضے خرید لیا ہے۔ سارے لوگ ہکے بکے رہ گئے۔ فیصل آبادی بوڑھے نے ہمت کرکے فلیٹ کے اندر جھانکا تو اندر بالکل صفایا تھا، ایک تنکا تک بھی موجود نہیں تھا۔

"حیرت ہے یہ چڑیل کس وقت اپنا سامان لے کر گئی ہے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔"

"بوڑھے فیصل آبادی نے اپنے آپ سے کہا اور پھر اس مشٹنڈے قسم کے

آدمی سے مخاطب ہوا جس نے فلیٹ کا قبضہ لیا تھا۔

"جناب آپ کے پاس الاٹمنٹ آڈر ہے؟"

"آپ پوچھنے والے کون ہیں؟" اس مشٹنڈے آدمی نے بوڑھے فیصل آبادی کو جواب دیا۔

"اس لئے کہ میں نے بھی اس کی الاٹمنٹ کی درخواست دی ہوئی ہے۔"

"ٹھیک ہے وہ پچاس ہزار لے کر قبضہ مجھے دی گئی ہے"۔ جو لوگ فلیٹ کے باہر کھڑے تھے وہ یہ سن کر بھونچکے رہ گئے کہ مرلی بڑھیا نے چپ چاپ کیسا چکر چلایا اور کوڑیوں کے مول فلیٹ بیچ دیا ہے۔

ایک دو دن کے بعد اس فلیٹ کی صفائی اور دھلائی شروع ہو گئی تھی لیکن ایک ہفتہ گزرنے کے بعد بھی وہاں کوئی نہ آیا۔ محلّہ کے لوگوں میں پھر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ایک شام تین سیاہ رنگ کی کاریں آئیں جن پر سبز پلیٹیں لگی ہوئی تھیں ان میں سے محکمے کے تین چار افسر باہر نکلے' انہوں نے پہلا تالا توڑا اور ایک پستہ قامت سیاسی شخصیت کو فلیٹ کا قبضہ دے دیا جس نے وہاں ایک دفتر قائم کرنا تھا۔ محلّہ کے لوگوں نے پھر شور مچایا کہ سب کچھ خلاف ضابطہ ہے' اس فلیٹ کو نیلام ہونا چاہئے جو سب سے زیادہ بولی دے گا' اسے یہ الاٹ کیا جائے۔ اس شور و شغب کی محکمے نے کوئی پرواہ نہ کی۔ دو تین دنوں کے بعد ایک تعمیراتی کمپنی کے نمائندے آئے اور دو ہفتوں کے اندر ہی ڈک کے خستہ فلیٹ کو ایک دیدہ زیب دفتر میں منتقل کر دیا۔ لیکن پھر بھی اس فلیٹ میں کوئی نہ منتقل ہوا' محلے میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ رات کو فلیٹ کے کمرے میں انکل ڈک کے بلڈاگ کے بھونکنے کی آواز گونجتی ہے۔ رات کو کتے کی آواز سنائی ضرور دیتی تھی لیکن یہ کوئی نہ جان سکا کہ یہ آواز کس کتے کی تھی۔

حکومت بدل چکی ہے نہ جانے اب یہ فلیٹ کس کو الاٹ ہوتا ہے۔

بد باطن

میرے ملنے والوں کی میرے بارے میں رائے اتنی اچھی نہیں ہے۔ میں ان کے خیال میں شکّی مزاج ہوں اور بے اعتمادی کا شکار ہوں اس لئے کسی کو دوست نہیں بنا سکا۔ میں دراصل انسان کے باطن سے واقف ہوں۔ یہ دنیا انسانوں سے لبالب بھری ہوئی ہے۔ کہنے کو تو سارے انسان جسمانی طور پر ایک سے ہیں لیکن ان کے باطن ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے انسان بد باطن ہوتا ہے' کچھ کا خیال ہے کہ انسان نیک باطن ہے۔ بیسویں صدی کے آخری دن ایک شخص نے یہ اعلان کیا تھا کہ انسان بغیر باطن کے ہوتا ہے۔ وہ وہی کچھ ہے جو کچھ دکھائی دیتا ہے۔ میں اس فضول سی بحث پر اپنے وقت کا ضیاع نہیں چاہتا' تاہم اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس طرح یہ دنیا پہلی دنیا' دوسری دنیا اور تیسری دنیا میں تقسیم ہوئی ہے' اس طرح انسان کا باطن بھی تقسیم ہو چکا ہے۔۔ اگر میرا اور آپ کا کوئی باطن ہے تو وہ تیسری دنیا کا باطن ہے۔ تیسری دنیا کیا ہے؟ اندھیر نگری جہاں اجالا صرف سورج کی روشنی سے ہوتا ہے۔ یہ بھی شک کی بات ہے۔۔

میں ادھیڑ عمر سے تجاوز کر چکا ہوں' شادی شدہ ہوں' میں نے نسل کشی سے گریز کیا ہے' اس لئے نہیں کہ مجھ میں تولیدی جرثوموں کی کمی ہے۔ میں اگر چاہتا تو اپنے ہم وطنوں کی طرح اکیلا ہی پوری نسل آدم کو وجود میں لا سکتا تھا۔ میں حوا

اور اس کی اولاد کی ذمہ داری نہیں لے سکتا تھا۔ مجھ پر پہلے ہی اپنا اتنا بوجھ تھا' میں دوسرے کا ذمہ دار کس طرح بن سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں ان ذلت آمیز مجبوریوں میں سے گزرنا نہیں چاہتا تھا جو اولاد والدین کے لئے پیدا کرتی ہے۔ میری بیوی نے بہت چیخ چہاڑا کیا لیکن میں نے اسے حوا سمجھ کر نظرانداز کیا۔ میں روزانہ ہزاروں لوگوں کو سڑکوں پر بے مقصد یا بامقصد مارا مارا پھرتا دیکھتا ہوں جن میں بیشتر کے پاس زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ حیوانوں کی زندگی بھی اسی طرح کی ہے۔ انسان کو بھی حیوان ناطق کہا گیا ہے۔

میں اپنے بارے میں آپ کو زیادہ کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ میں خود اپنے لئے اپنا موضوع نہیں ہوں' میں تو تحصیل میلسی کے ایک نوجوان جبار کی ایک ادھوری کہانی آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ میں نے سب کچھ دوسروں سے سیکھا ہے' میں جو کچھ ہوں دوسروں نے مجھے بنایا ہے۔ میں اپنے بارے میں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ میں نہ اچھا ہوں اور نہ برا۔ میرے بارے میں صرف یہی تفصیل کافی ہے کہ میرا تعلق ایک بیحد معمولی گھرانے سے تھا جہاں سنہرے خوابوں کی بجائے بھیانک خواب دیکھے جاتے تھے۔ میں ایک فارماسوٹیکل کمپنی میں کام کرتا تھا اور ترقی کرتا ہوا سیلز مینجر بن گیا۔ میری بیوی کی ضرورتوں کے لئے میری تنخواہ کافی نہیں تھی۔ میرے لئے جائز اور ناجائز میں کوئی فرق نہیں تھا۔ میرا سالہ حمید ایک عیار دنیا دار آدمی ہے جس نے میری بیوی کے کہنے پر دوائیوں کی دکان کھول لی اور میری ہی کمپنی کی دوائیاں بلیک کرنے لگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ میری بیوی کو کیا لیتا دیتا ہے۔ میری بیوی کے کپڑوں اور زیورات میں اضافے سے یہی لگتا ہے کہ وہ اسے ماہوار یا یک مشت کچھ نہ کچھ دیتا ہے۔ ایک دن میرے دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ میں نے قبل از وقت اپنے دفتر سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ کچھ جمع پونجی میرے پاس تھی اور کچھ دفتر نے ۲۵ سال کی ملازمت مکمل

ہونے پر میرے واجبات ادا کر دیئے۔ اگرچہ ملک میں سود کو حرام قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود میرا گزر ماہوار سود پر ہے۔ میں اس لئے معافی کا طلبگار ہوں۔ میری بیوی نے میری قبل از وقت ریٹائرمنٹ پر شدید احتجاج کیا' دنیا بھر کی تمام برائیاں مجھ میں نکالیں لیکن میں چپ رہا کیونکہ حوا چاہے قدیم ہو یا جدید اس سے بحث کرنا فضول ہے۔ شاید اسی لئے ڈپٹی نذیر احمد نے انہیں ناقص العقل کہا ہے۔ پھر بھی میں نے اپنی بیوی کو قائل کرنے کے لئے کہا۔ "میرا کون سا بال بچہ ہے کہ میں ساری عمر غلامی کی زندگی بسر کروں۔ آزادی میرا بھی تو حق ہے۔"

"اس کا مطلب کہ ہمارا وارث کوئی نہیں ہوگا' ہمارا نشان کوئی نہیں رہے گا؟" "ہماری تربتیں ہمارا نشان ہوں گی" میں نے جھلا کر اپنی بیوی کو جواب دیا۔"

کچھ دنوں کے بعد کسی کام کے بغیر زندہ رہنے سے میرا آزادی کا تصور کچھ دھندلانے لگا۔ ایک ایک کرکے میرے ملاقاتی بھی رخصت ہو گئے کیونکہ میں کسی کے کام نہیں آ سکتا تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ زندگی کیا ہے' اسے بلاسوچے سمجھے بسر کرنا چاہئے۔۔۔۔ دراصل میں میں اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے اور گھر کو آراستہ اور منظم کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں' اس طرح میں دوسروں کے جہنم سے تو بچ گیا ہوں لیکن میرے اندر تپش کا احساس بڑھنے لگتا ہے۔ میں جس گھر میں رہتا ہوں وہ کافی تنگ ہے۔ اس مکان کی بالائی منزل میرے پاس ہے اور اس کے نیچے سیاسی لوگ رہتے ہیں جو لوگوں سے کام کرانے کا بھتہ لیتے ہیں' سارا دن مجرا قسم کی موسیقی کا شور سنائی دیتا رہتا ہے۔ میں نے مالک مکان سے بارہا اس کی شکایت کی ہے اس نے مجھے متبادل مکان تلاش کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

میں میلسی کے نوجوان جبار کی کہانی تک پہنچنا چاہتا ہوں لیکن راستے میں کتنی

رکاوٹیں اور مداخلتیں ہیں۔ اگر اس طرح مداخلتیں ہوتی رہیں تو دو کہانیاں بن جائیں گی' ایک میری اور دوسری جبار کی۔ جب سے میں کام سے باہر آیا ہوں میری کہانی تو ختم ہو گئی ہے اور جبار کی ابھی شروع نہیں ہے۔ کہانی کے اس انداز پر نقاد بھی معترض ہوں گے کہ یہ دونوں کہانیاں آپس میں مربوط نہیں ہیں' ان میں وحدت نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں محتاط ہونے کی پوری کوشش کروں گا لیکن نہ کوشش کرتے ہوئے بھی یہ دونوں کہانیاں آپس میں کہیں نہ کہیں خلط ہو جاتی ہیں۔

اپنے گھر کی تنگی میرے لئے ہمیشہ پریشانی کا باعث رہی ہے' سارا دن اپنی چیزیں ڈھونڈتا رہتا ہوں' کبھی پین' کبھی گھڑی' کبھی بٹوہ۔ میری بیوی کہتی ہے کہ میں مخبوط الحواس ہو گیا ہوں ۔ میں حوا کی بیٹی سے کیا بحث کروں؟۔ مکان کی دوسری منزل پر دو تین چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں ہیں جن میں میرے والد مرحوم کی سینکڑوں کتابیں ایک امانت کی صورت میں جمع ہیں۔ وہ عربی کے مدرس تھے اور بڑے عالم تھے۔ انہوں نے مجھے بھی عالم بنانے کی کوشش کی لیکن میں نے گریز کیا کیونکہ میں عالموں کی بدقسمتی سے واقف تھا' اس لئے میں نے یہ کتابیں پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ گزشتہ ماہ میری بیوی نے گھر میں اپنی بھانجی کو مستقل رکھنے کا فیصلہ کیا' میں پریشاں ہو گیا' یہ میری آزادی میں مداخلت تھی لیکن کیا کرتا؟ اس کے کہنے پر میں نے دو کوٹھریاں خالی کرنے اور ان کتابوں کو ردی میں فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس فیصلے سے پہلے میں نے ایک محب وطن اور اچھے شہری کی طرح تین چار کتب خانوں کو خط لکھے کہ میں کتابوں کا بڑا ذخیرہ عطیے کے طور پر دینا چاہتا ہوں' ان میں سے کسی لائبریری کے مہتمم نے جواب نہ دیا۔ پھر میں فرداً فرداً ان کتب خانوں میں گیا۔ سب نے کہا کہ ان کے پاس جگہ نہیں ہے اگر میں کتابوں کے ساتھ شیلف بھی مہیا کروں تو وہ کتابیں وصول کر سکتے ہیں۔

ایک نے یہ جواب دیا کہ وہ کتابوں کی چھانٹی خود کریں گے۔ مجھے کوئی شرط قابل قبول نہیں تھی چنانچہ میں نے ان کتابوں کو ردی میں فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ کتابوں کی چھانٹ ایک لمبا کام تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے چھوٹے موٹے کام بھی ہیں جو میں خود نہیں کرتا' اس لئے میں چھٹی کے دن آدمی دہاڑی پر مزدور لے آتا ہوں جو میرے کام سنوارتا جاتا ہے۔ میرے پاس ایک چھوٹی سی پرانی کار ہے جو میں اتوار کے دن باہر نکالتا ہوں۔ سب سے پہلے میں مزدوروں کے اڈوں پر جاتا ہوں۔ شہر میں مزدوروں کے بہت سے اڈے ہیں جہاں منہ اندھیرے بہت سے مزدور کام کی تلاش میں مکھیاں مارے ہوئے آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ صبح نو بجے تک اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ انہیں کوئی ساتھ لے جانے والا مل جائے۔ دیہاتوں سے اتنی تعداد میں آئے ہوئے کسان اور بیکار لوگوں کی موجودگی سے یوں لگتا ہے کہ لوگ آہستہ آہستہ دیہات خالی کر رہے ہیں۔

جب میری کار مزدوروں کے اڈے پر آکر رکتی ہے تو مزدوروں کا ایک جم غفیر مکھیوں کی طرف جھپٹتا ہوا ایک ہی ریلے میں کار پر گر جاتا ہے اور ہر ایک ساتھ جانے کے لئے اتنی شدت سے اصرار کرتا ہے کہ بعض اوقات میں شرمندہ بھی ہو جاتا ہوں۔ میں قبرستان کے پاس کار روک کر سگرٹ سلگاتا ہوں اور مزدور سے بات چیت شروع کر دیتا ہوں۔ مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ اس کا نام پتہ اور موجودہ رہائش کا پتہ پوچھتا ہوں اور دل ہی دل میں اسے یاد کر لیتا ہوں کہ مجھے ہمیشہ اپنی ذاتی اشیا کی چوری کا احتمال ہوتا ہے۔ اگر اس کا کچھ اتا پتہ معلوم ہو تو میں آسانی سے اس تک پہنچ سکتا ہوں۔ نہ جانے میں ایسا کیوں سوچتا ہوں کہ ہر آدمی بنیادی طور پر چور ہے اور دوسرے کو دھوکہ دینے پر تلا ہوا ہے۔ شاید زندگی نے مجھے یہی کچھ بتایا ہے کہ انسان بدباطن ہے

میں نے بہاول پور روڈ پر قبرستان کے سامنے کار روکی' ایک پل کے لئے

سوچا کہ یہ خوابیدہ لوگ بھی کبھی میری طرح تھے اور کبھی میں بھی ان جیسا ہو جاؤں گا اور میری جگہ کوئی اور اسی طرح کار روک کر کچھ سوچے گا۔ کلائی کی گھڑی تیزی سے سفر میں محو تھی' مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میں نے اس مزدور کو آدھی دہاڑی کے لئے پابند کیا ہے' میں نے کم سے کم وقت میں اس سے زیادہ سے زیادہ کام لینا ہے چاہے اس کی ہڈیاں ہی کیوں نہ چیخ جائیں۔

میں نے اپنی کار کو تیز چلانا چاہا لیکن اس نے ضعیف العمری کی وجہ سے زیادہ مشقت کرنے سے انکار کر دیا۔ راستے کو اپنی منزل میں بدلنے کے لئے میں نے حسب عادت بات شروع کی۔ اس نے جواب دیا

"میرا نام جبار ہے اور میں میلسی کے پاس ایک گاؤں جنڈیالہ کا رہنے والا ہوں" میں نے جبار کا لفظ سن کر ترچھی نگاہ سے اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے نوجوان کو دیکھا جس کی عمر بیس برس کے قریب تھی اس نے گاڑھے کھدر کے میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے' ہاتھ پاؤں مضبوط تھے' اس کی ٹھوڑی بڑی ہوئی تھی اور ہر طرح کے تاثرات سے عاری پتھر ایسا چہرہ تھا جس سے اس کے باطن کا سراغ لگانا ممکن نہیں تھا۔ اس نے دو تین چاندی کی انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں' وہ کچھ کچھ وقفوں کے بعد اللہ تیری برکت کا کلمہ زیر لب ورد کرتا۔ مجھے اپنے آپ پر کچھ افسوس بھی ہوا کہ میں نے خوامخواہ قبل از وقت اس پر شک کرنا شروع کر دیا ہے۔

"تم اتنی دور سے کام کرنے کیوں آئے ہو' پھر یہاں کہاں ٹھکانا بنایا ہے؟ تمہارا کوئی جاننے والا ہے؟ مہینے میں تمہاری کتنی دہاڑیاں لگ جاتی ہیں؟" کتنے پڑھے ہوئے ہو؟" اس قسم کے سوالات میں ہر اتوار کو ہر مزدور سے کرتا جو میرے نجی کام کرنے کے لئے آتا۔ ان لوگوں کا بھی عجب دستور ہے کہ سارے شہر میں ان کی مزدوری کا ایک ریٹ ہے اور وہ اس سے ایک پیسہ کم نہیں لیتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ عام طور پر پوری دہاڑی پر کام کرتے ہیں۔ میرے پاس

اتنا کام نہیں ہوتا کہ میں انہیں پوری دہاڑی کے لئے کام پر لے جاؤں ویسے بھی جب سے بجٹ آیا ہے سب کا خانہ خراب ہو گیا ہے۔ میں بھی ان کی نفسیات سے آگاہ ہوں۔ میں جان بوجھ کر نو بجے کے بعد اڈے پر جاتا ہوں جب نصف سے زیادہ مزدور کاموں پر یا واپس گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ جو زیادہ ضرورت مند ہوتے ہیں وہ انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ جب میں انہیں پوری کی بجائے آدھی دہاڑی کا کہتا ہوں تو وہ پہلے انکار کر دیتے ہیں۔ میں گھڑی دیکھ کر کہتا ہوں کہ دہاڑی کا وقت کب کا شروع ہو چکا ہے' سارا دن بیکار رہو گے تو خرچہ کہاں سے کرو گے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں' مشورہ کرتے ہیں اور پھر ان میں سے کوئی ایک یکایک دوسروں کو دھکیلتا ہوا زبردستی کار میں بیٹھ جاتا ہے اور دوسرے اس کو گالیاں دیتے ہیں۔

"صاب گھر کون چھوڑتا ہے' جگہ جگہ دھکے کھانے کے بعد اس شہر میں پہنچا ہوں۔ دو ڈھائی سو میل تک میں نے سفر کیا لیکن مجھے کام نہیں ملا۔ میرے ساتھ گاؤں کے چار لڑکے اور بھی ہیں' کام بڑے شہروں میں ہیں' سارے چھوٹے شہر بڑے شہروں میں چلے گئے ہیں۔

میں نے میلسی کے جبار کی طرف دیکھا جو ان پڑھ ہونے کے باوجود سماجی فلسفے کا طالب علم لگنے لگا۔

"کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟

"چار جماعت' میرا باپ غریب تھا اس لئے پڑھائی چھوڑ دی"۔

"وہ کیا کرتا ہے؟"

"فوج میں سپاہی تھا' اب بہت بوڑھا ہے۔"

"کچھ زمین ہے؟

"ایک کلہ زمین ہے اور ایک بھینس ہے۔"

"کتنے بہن بھائی ہیں؟"

"چھ بہنیں اور دو بھائی"

"بھائی کیا کرتا ہے؟"۔

"وہ بھٹے میں کام کرتا تھا ملبے کے نیچے آکر مرگیا تھا۔"

"شادی شدہ تھا؟"۔

"اس کے چھ بچے ہیں۔"

"اللہ ہو اکبر" میں نے غصے میں کہا۔ "تم تیرہ چودہ لوگ زندہ کیسے ہو؟"۔

"اللہ کے سہارے۔"

"اللہ کے سہارے کائنات تو چل سکتی ہے لیکن انسان کو تو کچھ کرنا پڑتا ہے۔" میرا گھر قریب آگیا تھا' اس لئے میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھی۔ لیکن مکان کی سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے اس کے اتے پتے کی تصدیق کو ضروری جانا۔۔

"رات کو کہاں سوتے ہو؟"

"چوبرجی کے آگے پلاٹ میں۔۔ سو دو سو مزدور کھلے آسماں کے نیچے سوتے ہیں' باؤ صاب رات کو پولیس بہت تنگ کرتی ہے' کچھ نہ دو تو سونے نہیں دیتی۔"

"اگر تمہاری دہاڑی نہ لگے تو کھاتے کہاں سے ہو؟۔

"اللہ مہربان ہے' داتا دربار سے روٹی مل جاتی ہے۔"

"اچھے رہے ہو' یہ شہر تو ڈائن ہے سب کو کھا جاتا ہے اور تم لوگ اس کو مفت کھا رہے ہو۔"

جب میں گھر پہنچا تو میری بیوی اپنی بھانجی کو لے کر کہیں مٹرگشت کے لئے نکل گئی تھی۔ میں نے سیڑھیوں کا دروازہ کھولنے کے لئے ڈوپلیکیٹ چابی باہر نکالی تو نچلی منزل پر میرے ہمسایہ کے گھر میں سے راجکماری کے فلم محل کے گانے "یہ

رات پھر نہ آئے گی جوانی بیت جائے گی" کے بول باہر نکل رہے تھے۔ ڈھولکی کی تھاپ پر نچلی منزل کے رہائشی کی پستہ قامت لڑکی ناچ رہی تھی۔ ہوں' جوانی بیت جائے گی' یہاں تو بچپن' جوانی بڑھاپا ایک ہی سیدھی لکیر ہیں' اب تو سب کچھ بیت چکا ہے۔

میں پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا تھا کیونکہ اب گھر بالکل اکیلا تھا اور میں مڈریل میلی کے جبار کے رحم و کرم پر تھا جو میری چیزوں کو بڑے غور سے مضطرب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنے ذہن میں قیمتی چیزوں کی فہرست بنائی' اپنی گھڑی' شادی کی انگوٹھی' پرس' قیمتی پین وغیرہ کو دیکھا سب کچھ اپنی جگہ پر موجود تھا۔ پہلے بھی کئی مرتبہ ہر آنے والا مزدور کسی نہ کسی چیز کو جاتے وقت اپنی ملکیت سمجھ کر لے جاتا۔ میں اس مرتبہ محتاط تھا کیونکہ میں انسان کے باطن کے بارے میں بہت مشکوک ہوں' اس کا ظاہر اس کے باطن سے مختلف ہوتا ہے۔ میلی کے جبار کا ظاہر مشکوک تھا کیونکہ اس کے کھدر کے میلے کپڑے' اس کی بڑھی شیو' مضطرب آنکھیں اور ہر مرتبہ ورد کرنے کا شوق اور میری ہر چیز کا بغور مشاہدہ اس کے خلاف میرا سب سے قوی ثبوت تھا۔ نگرانی کا کام ذرا ٹیڑھا تھا۔ میں پہلی منزل پر رہتا ہوں اور میرے والد کا کتب خانہ اور دوسرا کوڑ کباڑ دوسری سے پہلی منزل پر لانا' پھر واپس اوپر جانا کافی دشوار تھا۔ شروع شروع میں تو ہر مرتبہ میں اس کے ساتھ اوپر نیچے آتا جاتا۔ میں پھر یہ سوچ کر دم لینے لگتا کہ دہاڑی تو اس نے لینی ہے' میں کسرت کیوں کر رہا ہوں؟ چنانچہ میں اوپر صحن پر اس کا انتظار کرتا کہ وہ دوبارہ کتابوں کا گٹھا لینے آئے۔ جب ذرا دیر ہو جاتی تو میں اسے چیخ کر آوازیں دیتا یا بھاگا بھاگا ہوا نیچے آتا کہ اس نے میری کوئی نہ کوئی چیز اٹھالی ہے اور اپنے ڈب میں یا کسی شاپر میں ڈال رہا ہے۔ مجھے ہر مرتبہ مایوسی ہوتی۔' مجھے یقین ہو چکا تھا کہ جبار ایک کاریگر چور ہے اس نے اس طرح میری

کوئی چیز چھپائی ہے کہ مجھے پتہ نہیں چلا۔ کام زیادہ تھا اور گھڑی کی سوئی کی تیز رفتاری کے ساتھ اس کی دہاڑی بھی ختم ہو رہی تھی' میں اس کی ہڈیوں سے زیادہ سے زیادہ کام لینا چاہتا تھا' میں نے اس کا وقت خریدا ہوا تھا۔ وہ ہانپتا جاتا اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اللہ کے نام کا ورد کرتا۔ میرا اضطراب بڑھتا جاتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ اسے ابھی گھر سے باہر نکال دوں' میں روز کی دس کتابیں نیچے اٹھا لاؤں تو اس طرح سال میں ۳۶۵۰ کتابیں نیچے لے آؤں گا اور پھر قسط وار اس کتابوں کو ٹھکانے لگاؤں اس طرح ان مصنفوں کی ہتک کروں گا جنہوں نے زندگی کو راستہ دکھانے کی کوشش کی۔

اسی دوران میری بیوی واپس آ گئی اور اس نے نیچے میرے کمرے اور گیلری میں کتابوں کے ڈھیر دیکھ کر شور مچانا شروع کر دی اور اپنی بھانجی کے ساتھ گھر کی چیزیں منظم کرنے لگی۔ اس اثنا میں میرا ایک ملنے والا آ گیا اور میں اس کے ساتھ باہر جانے سے پہلے جبار کو اس کی آدھی دہاڑی دے کر چلا گیا۔ شام گئے میں واپس آیا اور اپنے کمرے کی چیزیں سنوارنے لگا۔ مجھے معاً خیال آیا کہ میں نے میلسی کا جبار میری عدم موجودگی میں گیا ہے مجھے اپنی چیزوں کی پڑتال کرنی چاہئے۔ میں نے گھبراہٹ میں اپنی قیمتی چیزوں کی پڑتال شروع کی۔ باری باری پین' گھڑی' پرس وغیرہ چیک کئے سب اپنی اپنی جگہ پر موجود تھے' دل کو ذرا سکون ہوا۔ میں نے اپنی انگوٹھی پر رومال رکھ دیا تھا کہ اس چور شکل جبار کی نگاہوں سے یہ اوجھل رہے۔ رومال اٹھایا تو میرا دل دھک سے کانپا' انگوٹھی وہاں نہیں تھی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا' سر بھی قدرے چکرایا اور جلدی جلدی میز پر رکھی ساری چیزوں کو الٹ پلٹ کر کے دیکھا' انگوٹھی وہاں پر نہیں تھی۔ بد باطن شخص' کہنے کو چہرے پر داڑھی بھی تھی بار بار خدا کے نام کا ورد بھی کرتا ہے لیکن اندر سے بد باطن تھا' دنیا ایسے منافقوں سے بھری ہوئی ہے۔ میں نے تہیہ کر

لیا تھا کہ اب کبھی کام کے لئے کسی مزدور کو نہیں لاؤں گا۔ مجھے اس انگوٹھی سے اتنا جذباتی لگاؤ نہیں تھا کہ یہ میری شادی کی انگوٹھی تھی بلکہ اس لئے کہ یہ دو تولے کی تھی۔ گھر کے دوسرے کمروں میں میری بیوی اور اس کی بھانجی کمروں کی چیزوں کو الٹ پلٹ کر رہی تھیں۔ میری بیوی اونچی آواز میں میری لاپرواہی کا واویلا کر رہی تھی کہ یہ اس کے باپ کی نشانی تھی۔ میں اپنے کمرے میں سگرٹ پہ سگرٹ پیتا جاتا اور کبھی کرسی پر بیٹھتا اور کبھی ٹہلنے لگتا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو میری بیوی کی بھانجی مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

خالو" اس نے مجھے مدہم آواز میں مخاطب کیا۔ میں نے اس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا کیونکہ میں گھر میں اس کی موجودگی کو اپنی تنہائی میں ایک مداخلت سمجھتا تھا۔

"خالو" آپ کے ہاتھوں پر سیاہی لگی ہوئی ہے' یہ لیں کپڑا اس سے صاف کر لیں" میں نے اپنی دونوں ہتھیلیاں دیکھیں جن پر سیاہی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اس نے قدرے مسکرا کر کہا نہیں الٹے ہاتھ کی پشت پر لگی ہوئی ہے۔ میں نے اپنا الٹا ہاتھ الٹ کر دیکھا تو اس پر بھی کوئی دھبہ نہیں تھا۔ اب میں نے غور سے دیکھا تو ایک دم میرے منہ سے نکلا" او مائی گاڈ' مجھے یہ انگوٹھی کس نے پہنا دی ہے۔ میں نے اسے رومال کے نیچے رکھا تھا" میری بیوی کی بھانجی دروازے کی دہلیز سے غائب ہو گئی اور میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ میں نے تو یہ انگوٹھی پہنی ہی نہیں تھی۔ لیکن یہ کیسے اچھل کر میری انگلی میں آ گئی۔ میلسی کے جبار کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ کالا علم جانتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے اصل انگوٹھی اٹھا لی ہو اور اس کی جگہ ہو بہو پیتل کی انگوٹھی وہاں رکھ دی ہو۔ دوسرے کمرے میں سے میری بیوی کی آواز آ رہی تھی۔" خدا ایسے لوگوں سے بچائے' ظاہر میں کتنے شریف لگتے ہیں لیکن اندر سے بد باطن ---"

گردش

چاروں طرف بارش ہی بارش ہے۔ اس بوسیدہ عمارت کے خمیدہ برآمدے کی چھت میں سے پانی کی لکیریں دھیرے دھیرے دیواروں پر رینگ رہی ہیں۔ ہوا ساکت ہے اور بے حد حبس۔ بارش کی یورش سے پناہ لینے والے ہجوم کے بدنوں پر پسینے کی لکیریں میلی، پھٹی دھبے دار قمیضوں پر نمودار ہو رہی ہیں۔ چہرے شرابور اور بدنوں پر کھجلی، موٹے موٹے چیونٹے، کٹے پھٹے اور بے ہیئت بوٹوں پر آہستہ آہستہ چڑھ رہے ہیں۔ پاس بہتے ہوئے گندے نالے کی بو، انسانی بدنوں کی بو اور عمارت کے سامنے پھیلے ہوئے لان سے گھاس کی بھیگی بھیگی سی بو، برآمدے میں نصب آہنی سلاخوں کے عقب میں ٹوٹی پھوٹی کرسیوں پر دیہاتی شکلوں کے اہلکار سگرٹ پینے میں مصروف۔ عقبی دروازے سے کوئی ایک داخل ہوتا ہے۔ کسی اہلکار سے سرگوشی کرتا ہے اور کسی قدر اطمینان سے باہر نکل جاتا ہے۔ ہر کوئی عقبی دروازے سے اندر نہیں آسکتا۔ برآمدے میں جمع ہجوم صبح سے ایک دوسرے کے مضطرب چہرے دیکھ دیکھ کر عاجز آچکا ہے۔ کوئی زیر لب بڑبڑا رہا ہے۔ کوئی تیز تیز قدم اٹھا رہا ہے، کوئی جلدی جلدی سگرٹ پی رہا ہے۔ ان بے نام افراد میں حمید ایک فرد ہے، ایک نام ہے، ایک نامکمل گھرہے، بارش کبھی تیز ہو جاتی ہے اور کبھی پل کے لئے تھمتی ہے۔ ہجوم میں سے بعض کھڑکیوں کے

عقب میں موجود عملے سے التجا، دھمکی، سفارش اور ہر طرح کے حربے استعمال کر چکے ہیں۔ لیکن کوئی لہجہ انہیں متاثر نہیں کر سکا۔ ہجوم اور کھڑکیوں کے عقب میں موجود عملے کے درمیان آہنی سلاخیں ہیں۔ یہ فیصلہ تاریخ ہی کر سکتی ہے کہ ان میں سے قیدی کون ہیں۔ کیونکہ سلاخوں کی دونوں طرف لوگ ہیں۔ حمید معنی خیز نظروں سے ہجوم اور عملے کو باری باری دیکھتا ہے۔ پھر وہ اپنی کلائی کی گھڑی پر سیکنڈز کی پھدکتی ہوئی سوئی کو دیکھتا ہے جو کسی سوچ کے بغیر گھڑی کے سیاہ ڈائل میں محو سفر ہے۔ چار بجے اس نے ٹیوشن پڑھانے جانا ہے۔ پھر نصف گھنٹے کا سفر کر کے چھ بجے ایک دوسری کوٹھی میں دوسری ٹیوشن پڑھانی ہے، ساڑھے سات بجے تیسرے فلیٹ پر ایک اور ٹیوشن پڑھانی ہے۔ نو بجے گھر واپس آجاتا ہے اور پھر اپنے اور اپنی معذور خالہ کے لئے رات کا کھانا پکاتا ہے۔ یہ اس کا ٹائم ٹیبل ہے جس پر وہ سات سال سے کاربند ہے۔ ان سات سالوں میں صرف ایک تبدیلی ہوئی ہے۔ اس کی واحد رشتہ دار خالہ مفلوج ہونے کے بعد قریباً نابینا ہو چکی ہے۔ ان سات سالوں میں اس نے پرائیویٹ طور پر ایم اے اقتصادیات پاس کر لیا ہے۔ ان سات سالوں میں اس نے لاتعداد ٹیوشنیں پڑھائی ہیں۔ لاتعداد گھروں کے مناظر دیکھے ہیں مگر اس کے باوجود کچھ پس انداز نہیں کر سکا۔ کیونکہ ٹیوشنیں تین چار مہینوں کے بعد ختم ہو جاتی ہیں۔ جونہی امتحان ختم ہوتے ہیں اسے اپنی پرانی سائیکل پر مختلف علاقوں میں گھومنا ہوتا ہے۔ وہ ایک جانور کی طرح سال کے فارغ حصہ کے لئے کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیتا ہے۔ مگر یہ اندوختہ زیادہ دیر تک نہیں چلتا، کیونکہ وہ روزانہ کیپسٹن کے بیس سگریٹ پیتا ہے اور ہر رات اسے ایک جاسوسی ناول بھی پڑھنا ہوتا ہے۔ وہ ہر مہینے میں پچیس کتابیں بھی خریدتا ہے اور پھر مہینے کے آخری دن ان تمام ناولوں کو چوتھائی قیمت پر فروخت کر دیتا ہے۔ کوارٹر کے دوسرے کمرے میں اس کی خالہ کراہتی رہتی ہے۔ وہ

اسے وقفے وقفے کے بعد دوائیاں دے کر صحت کی جھوٹی تسلیاں دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس کے معمولات کا حصہ ہیں۔ جاسوسی ناولوں کے مسلسل مطالعے سے اسے کم سے کم یہ ضرور پتہ چلا ہے کہ وہ بدصورت ہے اور اس کی قسمت کا فیصلہ اس کی پیدائش کے وقت ہی ہو چکا ہے کہ اسے ایک خاص ماحول میں زندگی بسر کرنی ہے۔ اسے زندگی میں صرف ایک ہی حادثہ پیش آیا ہے۔ وہ دس برس کا تھا کہ اس کے والدین ایک ہی بس میں سفر کرتے ہوئے ہلاک ہو گئے تھے۔ اس واقعہ کو تقریباً چودہ برس بیت چکے ہیں۔ اس نے دس برس کی عمر سے لے کر آج تک اچھے مستقبل کی خواہش میں محنت ہی محنت کی ہے۔ مگر اسے محنت کا اجر نہیں ملا ہے۔ بارہ برس کی عمر میں وہ صبح کارپوریشن کے سکول میں جاتا اور شام کو ایک جلد ساز کی دکان پر کام کرتا۔ پچیس برس کی عمر میں بھی وہ اپنی خالہ کے کوارٹر میں مقیم ہے۔ اب وہ جلد سازی کی دکان پر نہیں جاتا۔ صرف ٹیوشن پڑھاتا ہے۔ کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکوں کے ناز نخرے اور بدتمیزیاں سہتا ہے۔ کافی لڑکے اس کی محنت سے اچھے نمبروں سے پاس ہوئے ہیں مگر کسی نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی ہے۔ ایک افسر کا لڑکا کچھ اپنی لیاقت اور کچھ اس کی محنت سے اول آیا۔ اس نے ہمت کر کے افسر کو کہا کہ اسے کہیں مستقل ملازمت مل سکتی ہے۔ "اچھی ملازمت کے لیے تعلق چاہیے ہے۔ ملازمت مل بھی جائے تو اسے سنبھالنا بہت مشکل ہے۔" افسر نے اسے تنبیہ کر کے کوٹھی سے باہر کا راستہ دکھایا تھا۔ اس کے بعد حمید نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ اپنی ضرورت نہیں بتائے گا۔ کیونکہ ضرورت بہت جلدی کمزوری بن جاتی ہے اور پھر ہر کوئی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ "شاید یہ لوگ میری ضرورت سے فائدہ اٹھا کر مجھے روندنے کی کوشش کرتے ہیں۔" حمید نے رومال سے چہرہ صاف کیا ہے۔ جنگلے کے پیچھے بیٹھے ہوئے دو اہلکاروں کو مخاطب کرنے کی ہمت کی ہے۔ لیکن وہ متوجہ ہونے کے لئے آمادہ

نہیں ہیں۔ بارش تھم چکی ہے۔ برآمدے میں اکا دکا نامعلوم افراد موجود ہیں۔ جنگلے کے پیچھے کمرے میں سوائے ان دو کے باقی سب جا چکے ہیں۔ حمید نے گھڑی کی طرف دیکھا ہے چار بجنے میں دس منٹ رہ گئے ہیں۔ جنگلے کے پیچھے بیٹھے ہوئے اہلکار، فائلوں اور رجسٹروں اور دیگر دستاویزات کو ردی کا مال سمجھتے ہوئے بیدردی سے الماریوں اور طاقچوں میں اٹھا اٹھا کر پھینک رہے ہیں۔ "اگر میں آج اپنی درخواست رجسٹری کر دوں تو پھر بھی یہ اندر میعاد ہو گی۔" بڑی دیر کے بعد اخبار میں کسی معقول ملازمت کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ میری سوانح عمری ملازمت ک تمام ضروریات پورا کرتی ہے۔ ایک ہفتہ پہلے اس نے اپنی پرچی پیدائش کی نقل کے لئے درخواست دی تھی کیونکہ یہ پرچی اس کی پیدائش کا ثبوت ہے۔ حمید نے کسی قدر لجلجا کر جنگلے کے عقب میں مصروف اہلکاروں میں سے ایک کو مخاطب کیا ہے۔

"دیکھئے میں چھ دنوں سے انتظار میں ہوں۔ نقل تیار ہو گئی ہے۔؟ میرے لئے پرچی پیدائش ضروری ہے۔ آج درخواست دینے کی آخری تاریخ ہے اور میں آج کے بعد اوور ایج ہو جاؤں گا۔"

دوسرا اہلکار ہنسنے لگا۔

"پرچی پیدائش نہ تمہاری عمر بڑھا سکتی ہے اور نہ گھٹا سکتی ہے۔"

"دیکھئے میں التجا کرتا ہوں۔ میں بھی کبھی آپ کے کام آسکتا ہوں۔"

"جب تم افسر بنو گے میں بوڑھا ہو چکا ہوں گا۔"

دوسرے اہلکار نے کس قدر غصے سے جواب دیا ہے اور پھر دونوں ہنسنے لگے ہیں۔

"چلو یار کیا یاد کرے گا۔ ٹھہرو میں رجسٹر دیکھتا ہوں پہلے تمہاری درخواست ڈھونڈتا ہوں۔"

حمید نے اطمینان کا سانس لیا ہے۔ سارے دن کی کوفت یک لخت غائب ہو گئی ۔ "سب اہلکار یک جیسے نہیں ہوتے ٹھیک ہے ہم ایک شہر میں ایک ہی آسمان کے چھت کے نیچے رہتے ہیں۔ ایک ہی طرح کی سڑکوں پر چلتے ہوئے ایک دوسرے کا برا سوچتے ہیں۔ بعض لوگ ابھی تک ----" اس سوچ کے ساتھ حمید کا اطمینان اعتماد میں بدلنے لگا ہے۔ کچھ دیر کے بعد پہلا اہلکار اس کی درخواست تھامے ہوئے سلاخوں کے پاس آکر کہتا ہے۔

'یار تمہاری پیدائش کا اندراج نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟ میں پیدا نہیں ہوا ہوں۔"

حمید نے ایک دم بے تابی سے جواب دیا ہے۔

"آپ نے رجسٹر تو دیکھ لیا ہے"

"بالکل"

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں آپ کے سامنے ہوں۔ اسی شہر میں ہوں۔ شہر کے بہت سے لوگ مجھے جانتے ہیں۔"

"نوجوان ٹھیک کہتے ہو لیکن تمہاری پیدائش کا ثبوت نہیں ہے۔"

"جناب میری درخواست رہ جائے گی میرے مستقبل کا مسئلہ ہے.. مجھے چھو کر دیکھیں میرے والدین کی قبریں بھی اسی شہر میں ہیں۔ وہ شہادت دے سکتی ہیں ----" حمید کچھ اور کہنا چاہتا ہے لیکن دونوں اہلکار جا چکے ہیں۔

حمید سگرٹ سلگا کر سیڑھیاں اترتے ہوئے آہستہ آہستہ باہر نکل آیا ہے۔ مطلع صاف ہو چکا ہے۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں جہاں ہوں وہیں مجھے رہنا ہے۔ اس شہر کے ریکارڈ کے مطابق میں نے جنم نہیں لیا۔ مگر یہ سڑکیں میری موجودگی کی شہادت دے سکتی ہیں جن پر میرے قدموں کی لاتعداد مہریں ثبت ہیں۔ ہر کوئی مجھے چھو کر میری

موجودگی کا ثبوت دے سکتا ہے۔ چلو' میں نے جنم نہیں لیا' جنم تو وہ لیتا ہے جس کا کوئی تصدیق کرنے والا ہو۔ میری تصدیق کون کرے۔ تاریخ میرے وجود سے بے خبر ہے۔ میں ایک واقعہ ہوں جسے درج نہیں کیا گیا۔ میں ہجوم ہوتا تو کوئی مورخ مجھے بھی گوشوارے میں درج کرتا۔ میرا باپ کہتا تھا ضرورت کمزوری بن جاتی ہے' حمید نے سٹینڈ سے سائیکل اٹھائی ہے۔ گھڑی دیکھی ہے اور ٹیوشن پڑھانے کے لئے تیز تیز سائیکل چلاتے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگا ہے۔

"میری سائیکل کا پہیہ اور یہ زمین ہمیشہ کے لئے گردش میں رہیں گے۔"

فیصلہ

یہ جگہ کچھ غیر معمولی تھی، اس لئے نہیں کہ اس کے بیشمار چھوٹے چھوٹے کمروں میں روشنی سے زیادہ تاریکی کا غلبہ تھا، اور اس کے اندر اور باہر ہر وقت فاقہ مست لوگ میلے کچیلے کپڑوں اور بیمار چہروں کے ساتھ آتے جاتے رہتے تھے بلکہ اس لئے کہ یہاں جو شخص بھی آتا وہ اپنے آپ کو کائنات کا سب سے زیادہ دکھی اور مصیبت زدہ شخص تصور کرتا تھا۔ لوگ سائل بن کر یہاں کے اہلکاروں کے سامنے زندگی میں بے سہارگی اور حسرت کی ایسی تصویر کھینچتے کہ سخت دل آدمی کا دل بھی موم ہو جاتا۔ لیکن اس کے باوجود ان کی گریہ زاری موثر ثابت نہ ہوتی۔ شاید اس لئے کہ یہاں کام کرنے والوں کو مصیبت سے پیدا ہونے والے شیون سننے کی عادت ہو چکی تھی۔ اگر عادت نہ بھی ہوتی تو انہیں ان کی مدد کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ اس ادارے کے کسی اہلکار کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں تھا کہ سائل نادار ہے اور مدد کا مستحق ہے۔ اس ادارے کا کام صرف چیک تیار کر کے ایسی جگہ بھیجنا تھا جہاں ضرورت مند اسے حاصل کرنے کے لئے چکر لگا لگا کر پہلے سے بھی زیادہ نادار ہو جاتا تھا یا پھر ان کو صلواتیں سناتا ہوا صبر شکر کر لیتا اور آسمان کی طرف دیکھتا۔

یہ ادارہ چوں چوں کا مربہ تھا۔ یہاں کے بیشتر اہلکار دیہاتی تھے جو تلاش معاش کے چکر میں کسی نہ کسی وسیلے سے اس دفتر میں آ پہنچے تھے۔ انہیں کام کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ یہاں صرف تنخواہ ملتی تھی جو ان کی ضرورت کے لئے بدن پر بنیان کی مانند تھی۔۔۔ یوں بھی اس ادارے کی شہر میں کوئی وقعت نہیں تھی کیونکہ اس کا تعلق ناداروں سے تھا۔ چنانچہ اس ادارے کے اہلکار ہمیشہ اس چکر میں رہتے کہ جب کبھی بھی کوئی بہتر ملازمت مل جائے تو اس کو خیرباد کہیں۔ لیکن یہ فرار سیاسی پشت پناہی کے بغیر عام طور پر ممکن نہیں تھا۔ یہاں رہنے کی مجبوری نے ان کی طبیعت میں چڑچڑاپن پیدا کر دیا تھا۔ یہ حالات دیکھ کر اب ان اہلکاروں میں سے بیشتر شام کو جز وقتی ملازمتوں کی تلاش میں تھے۔ یہ ادارہ ناداروں کیلئے اگر امید نہیں تو موہوم امید کی ایک علامت تھا کہ یہاں سے کبھی کچھ نہ کچھ تو ضرور مل جائے گا۔ مہنگائی کے زمانے میں صرف اتنی تنخواہ ملتی تھی جو موت سے بچا کر طرح طرح کے ذہنی عارضے پیدا کرتی تھی۔ یہاں کام کرنے والوں کو یہ رنج ضرور تھا کہ وہ سارا دن دوسروں کی مالی امداد کے لئے کاغذات تیار کرتے تھے۔ اس بے ثمر ادارے کا ایک نگران بھی تھا جو خود بے سہارا تھا اور ہر طرح کی علمی، تعلیمی اور ملازمتی ڈگریوں اور تجربے کے باوجود کچھ نہ کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ وہ چند ایک فائلوں پر دستخط کرتا، سگرٹ پیتا رہتا، جب کمرے میں بالکل سناٹا چھا جاتا تو اپنی میز کی دراز سے ناول نکال کر پڑھنے لگتا۔ ناول کی دنیا اس کی دنیا سے بالکل مختلف تھی۔ وہ ناول اس لئے پڑھتا کہ وہ فارغ تھا اور رنجیدہ بھی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی صلاحیتوں کا اعتراف نہیں کیا گیا اور اسے ایک ایسی جگہ پر لگایا گیا تھا جو بھول بھلیوں کی مانند تھی جہاں آدمی اپنے آپ کو بھی بھول جاتا اور اسے فرار کا کوئی دروازہ نہیں مل سکتا۔ اسے یہ بھی رنج تھا کہ بہت سے سالوں سے اس کی تنخواہ ایک نقطے پر آ کر منجمد ہو چکی تھی

جبکہ باہر قیمتیں ایک مضطرب ذہن کی طرح کسی ایک نقطہ پر رکنے کے لئے آمادہ نہیں تھیں۔

۱۱ بجے دوپہر کے بعد لوگ اس کے کمرے میں آنے لگتے' ان میں زیادہ تر عورتیں ہوتیں۔ کسی نے گود میں دو بچے اٹھائے ہوتے اور ایک دو ساتھ ہوتے۔ ہر ایک اپنی پتا سناتی' ہر ایک اپنی بیوگی کے دکھ اور اولاد کی زیادتی کا شیون کرتی' ہر ایک اپنے خاوند کی دوسری شادی یا اسے تیاگنے کا قصہ بیان کرتی۔ ہرچند کہ ہر ایک کا قصہ دوسرے سے مختلف ہوتا لیکن تمام کا مقصد ایک تھا۔ یہ قصے بعض دفعہ اتنے الجھے ہوئے ہوتے یا ان میں اتنی ملاوٹ ہوتی کہ جھوٹ یا سچ میں تمیز قائم کرنا ممکن نہیں تھی' ہر عورت اپنی پتا کے بیان میں اپنے بچوں کی تعداد ضرور بتاتی۔ ایک دن اس جگہ کے نگران نے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کی کہانی سننے کے بعد کہا۔

"بس بس تو پھر تم نے گیارہ بچے کیوں پیدا کئے' اگر تم ان کی پرورش نہیں کر سکتی؟" میں نے کہاں پیدا کئے ہیں' بچے تو مرد پیدا کرتے ہیں' ان سے پوچھو لیکن مجھے کچھ دو' میں نے تین بچیوں کی شادی کرنی ہے۔

ہر روز اس طرح کی آہ و فریاد سننے کے بعد اسے یقین ہو چکا تھا کہ بدحالی اور ذرائع کی کمی یہاں کی مستقل صورت حال ہے جو لاینحل ہے' اس کے بارے میں غور نہیں کرنا چاہیے۔ وہ کہانی سننے کے بعد معمول کے مطابق کافی پیتا' سگرٹ سلگاتا اور ناول پڑھنے لگتا۔ ایک دن پچھلے پہر وہ اپنے دفتر میں معمول کا کام کرنے کے بعد گھر جانے کے لئے بریف کیس میں کاغذات رکھ رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی قدرے فربہ اور کچھ خوب رو میلے کپڑوں میں ملبوس عورت اس کے کمرے میں دھڑام سے در آئی' اس کے ساتھ ایک کدو قسم کا پانچ سالہ ریں ریں کرنے والا بچہ بھی تھا۔ کچھ دیر تک وہ لاتعلقی سے اس کی باتیں سنتا رہا پھر اس عورت سے کہا۔

"بی بی تم سے کس نے کہا کہ یہاں پلاٹ ملتے ہیں اور غریب کو وظیفہ بھی لگ جاتا ہے۔"

"سیالکوٹ میں تو سب یہی کہتے تھے۔"

"یہاں آنے سے پہلے کسی پڑھے لکھے سے پوچھ لیا ہوتا بس اب تم جاؤ چھٹی کا وقت ہے۔"

"چلی جاتی ہوں"

اس نے غصے میں کہا' لیکن واپس جانے کا کرایہ بھی دے دو۔

"کتنا؟"

"سو روپے"

"کیا تم مجھ سے پوچھ کر یہاں آئی تھیں' تمہارا شوہر کہاں ہے۔"

"وہ سعودیہ میں ہے اچھا آدمی نہیں' اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ بس تفصیل نہ پوچھیں۔ میرے کرائے کا بندوبست کریں خدا کا واسطہ ہے۔"

اسے اس عورت پر کچھ غصہ بھی آیا' اس نے گھنٹی بجائی اور اس عورت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے نائب قاصد سے کہا۔

"اسے شاہ صاحب کے پاس لے جاؤ اور کرایہ لے دو" اس نے بریف کیس میں اپنی چیزیں رکھ لیں اس کے دونوں تالے بند کئے' یکے بعد دیگرے دو ٹیلیفون آئے اور اس نے اپنے بارے میں مختصراً جواب میں کہا کہ وہ گھر جا چکے ہیں۔ وہ بریف کیس تھام کر اپنی کرسی سے اٹھا ہی تھا کہ اس کا ماتحت بوڑھا شاہ اس عورت اور بچے کے ساتھ کمرے میں غصے میں بھرا ہوا داخل ہوا۔

"جناب میں ملازم پیشہ ہوں' میں اسے کہاں سے کرائے کے لئے سو روپیہ دوں؟" وہ اپنے ماتحت کی بات سن کر عیاری سے جواباً مسکرایا کہ وہ سمجھ لے کہ اس نے عورت سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس کے پاس بھیجا تھا۔

"جناب سناؤں اس نے مجھ سے کیا کہا ہے؟"

اس نے عورت سے کسی قسم کا ردعمل کا اظہار کئے بغیر کہا "بتاؤ۔"

"جناب کہتی ہے میں سیالکوٹ واپس جانے کا کرایہ کہاں سے لوں؟ اب بھیک مانگوں یا برا کام کراؤں؟"

"تم نے یہ کہا ہے؟" اس نے بریف کیس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں میں نے کہا ہے، لیکن آپ فیصلہ کرو میں نے کیا کرنا ہے؟

"تم نے ایسا کیوں کہا ہے؟"

" مجھ سے کیا پوچھتے ہو، اپنے آپ سے پوچھو، مجھے سیالکوٹ واپس جانا ہے۔

"تمہیں پتہ ہے کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں؟"

"جس کے پاس کچھ نہ ہو، اس کے لئے سب کچھ صحیح ہوتا ہے۔" وہ یہ کہہ کر غصے سے اپنے بچے کو گھسیٹتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

بریک ڈاؤن

آج صبح صبح اخبار کے حوالے سے نئی بحث شروع ہوئی ہے کہ یہ تخریب کاری کا نتیجہ تھی یا غیر معمولی حدت سے خود بخود آگ لگ گئی تھی۔ ایک طرف سے کہا گیا ہے کہ شہریوں کو پتنگ اڑانے کا بہت شوق ہے اور آجکل پیتل کی تار سے پتنگیں اڑائی جاتی ہیں اور عین ممکن ہے کہ پتنگ گرنے سے ٹرانسفارمر میں آگ لگ گئی ہو۔ میں اس واقعہ کا عینی شاہد ہوں اور اس سے اس حد تک متاثر ہوں کہ دو تین دنوں میں میرے اعصاب جواب دینے لگے ہیں۔ یہ پرامن علاقہ ہے یہاں تخریب کاری تو ممکن نہیں ہے۔ یہاں کے لوگوں کو صرف ایک ہی جنون ہے کہ جائز یا ناجائز طریقے سے زیادہ سے زیادہ رزق کمایا جائے۔ تخریب کاری تو سات میل دور ساحلی شہر میں ہو رہی ہے جہاں روزانہ قتل ہوتے ہیں ڈکیتیوں کی وارداتیں ہوتی ہیں۔ اور ایک ہی شہر کی چھت تلے رہنے والے ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں یہ لوگ علیحدگی چاہتے ہیں یا حق مانگتے ہیں؟ جب ایسے حالات ہوں سچ اور جھوٹ میں فرق ختم ہو جاتا ہے۔ دراصل حقیقت جاننے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح کہ گرڈ سٹیشن میں آگ کیسے لگی تھی جس سے شہر کا ایک حصہ متاثر ہے اور باقی ساری دنیا مزے میں ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے اور میں بات پھیلانا نہیں چاہتا لیکن بات

کرنا ضرور چاہتا ہوں کہ آج کل غیر معمولی واقعات جنم لے رہے ہیں لیکن واقعات کو تو انسان جنم دیتے ہیں' واقعہ تو ایک مظہر ہوتا ہے لوگ اس میں سے طرح طرح کے معانی نکال لیتے ہیں۔ میں اس شہر کے لوگوں سے خوش نہیں ہوں' یہ تماش بینوں کا شہر ہے جو صرف دیکھتے ہیں اور کسی بات کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار نہیں ہیں' جب کوئی معاملہ خراب ہو جائے وہ ایک دوسرے کو موردالزام ٹھہراتے ہیں۔ جب بس نہ چلے تو سارا معاملہ حکومت کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ ابھی تین دن ہوئے کہ میں آتشزدگی کے خوفناک واقعہ سے پریشان ہو کر اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں چلا آیا تھا۔ گھر بیٹھ کر بجلی پانی کا انتظار کب تک کرتا۔ اس مصیبت میں یہ ہوا کہ میری بیوی بچوں کو ساتھ لے کر اپنے بھائی کے گھر چلی گئی اور جاتی مرتبہ کہہ گئی کہ جب بجلی پانی آئے تو ہمیں اطلاع دینا۔ گھر کا خیال رکھنا۔ آج کل ڈاکے بہت پڑ رہے ہیں"۔ گھر والوں کی اس ہجرت سے میرا بوجھ کچھ کم ہوا کہ مجھے گھر کے ہر فرد کے لئے پانی ڈھونڈ کر نہیں لانا ہو گا۔ مجھے گرمی کی شدت سے پیدا ہونے والی چیخ وپکار نہیں سننی پڑے گی۔ شاید آپ بھی میری طرح اس شہر میں رہتے ہیں اس لئے میں اپنی بات کو قدرے تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ آپ بھی جان لیں کہ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ہماری زندگی ایک دوسرے سے کتنی مختلف ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ایک ہی شہر میں بہت سے شہر بلکہ بہت سی ریاستیں قائم ہو چکی ہیں جو ایک دوسرے سے لاتعلق ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر پچھلے چند دنوں سے میں جس عذاب میں مبتلا ہوں میری مدد کو کوئی نہیں آیا۔ قصہ یوں ہے کہ آج تیسرا دن ہے کہ میرے گھر میں پانی نہیں ہے' مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا ہے کہ پانی اصل زندگی ہے' پانی چاہے دریائے فراط کا ہو یا مونسپل کارپوریشن کے نلکے کی ایک بوند' یہ سب کے لئے ناگزیر ہے۔ میں جگہ جگہ اسے شہر میں

تلاش کرتا ہوں جو بھی نلکا کھولتا ہوں اس میں سے ایک بوند گرتی ہے اور پھر نلکا ہچکیاں لینے لگتا ہے۔ میرے پاس صرف ایک گلاس پانی رہ گیا ہے جس کو میں نے پینا ہے۔ منہ ہاتھ دھونے ہیں اور اسی سے طہارت کرنی ہے۔ میں نے اپنی کالونی سے باہر نکل کر دیکھا ہے معمول کے مطابق سڑک پر کاروں۔ ویگنوں اور رکشاؤں کا سیلاب ہے اور کسی کو تشویش نہیں ہے کہ یہ آبادی پانی سے محروم ہو چکی ہے اور اس کے بیشتر مکین فرار ہو کر دوسرے علاقوں میں اپنے رشتہ داروں کے پاس اس امید سے چلے گئے ہیں کہ یہ ایک دن کی بات ہے پھر پانی خود بخود ہی آ جائے گا۔ پانی کا تعلق بجلی سے ہے' بجلی آئے گی تو پانی آئے گا۔ میں نے دانت پیس کر اپنے آپ سے کہا ہے۔ اور ٹہلتا ہوا واپس آ گیا ہوں۔ میں جس کالونی میں رہتا ہوں اس کے اردگرد ایک چار دیواری ہے۔ درمیان میں ایک پختہ سڑک ہے جو بل کھاتی ہوئی چلتی ہے اور اس کی دونوں جانب پرانی وضع کی کوٹھیاں ہیں جو انگریزوں کے زمانے میں تعمیر کی گئی تھیں یا پھر ان کے جانے کے بعد ان کے اسلوب تعمیر کو استعمال کیا گیا تھا' موٹی موٹی دیواریں اور اونچی اونچی چھتیں۔

شام کا پچھلا پہر ہے اور گرمی کسی قدر کم ہو گئی ہے اور میری پیاس بڑھ رہی ہے۔ جی میں آتا ہے کہ ایک ہی گھونٹ میں سارا گلاس پی جاؤں' پھر سوچتا ہوں کہ میں رات کو کیا کروں گا؟ نہ جانے کب پانی آتا ہے اسی سوچ کے ساتھ میرے اندر حدت بڑھنے لگی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں کسی بہت بڑے الاؤ کے پاس کھڑا ہوں جس کی حدت سے میرے سارے بدن میں پیاس دھیرے دھیرے آگ کی مانند پھیلتی جا رہی ہے۔ لیکن آگ تو تین دن پہلے لگی تھی۔ ہوا یوں کہ میں سہ پہر پلنگ پر لیٹا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ مجھے اپنے گھر سے باہر سڑک پر کالونی کے اندر شور سنائی دیا' میں جلدی سے باہر نکلا تو کچھ لوگ سڑک پر

کھڑے تھے، میں نے جونہی سر اٹھایا تو درختوں کے پیچھے سے ہیبت ناک شعلے آسمان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"پاور ہاؤس میں آگ لگ گئی ہے" ایک راہگیر، جو تماشا دیکھنے کے لئے کالونی کے اندر چلا آیا تھا، مجھے دیکھ کر بولا۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"۔ میں نے غصے سے پوچھا۔

"بس یہی دیکھ رہا ہوں کہ آگ کیسے لگتی ہے؟"۔ میں اس سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنے گھر کے گیٹ سے کچھ دور کھڑا تھا کہ میرے اہل خانہ، جو آگ کی تپش سے گھبرا کر باہر نکل آئے تھے، ایک دم چیخے ـــ

"پیچھے ہٹو، آگ آگے بڑھتی جا رہی ہے"۔ میں بمشکل گیٹ کے اندر ہی پہنچا تھا کہ میرے سامنے کی کوٹھی میں رہنے والے ہمسائے کی بیوی اپنے تین بچے لے کر اندر آ گئی۔

"میں یہاں کچھ دیر ٹھہر سکتی ہوں؟"۔

"کیوں نہیں" میری بیوی نے جواب دیا۔

"آپ کا اور ہمارا گھر پاور ہاؤس کے بہت قریب ہیں یہاں سے نکل جانے میں ہی سلامتی ہے" ہمسایے کی بیوی نے مشورہ دیا۔

میرا بیٹا کار میں اپنی ماں اور بہن کو لے کر اپنے ماموں کے گھر چھاؤنی چلا گیا ہے اور جانے سے پہلے ہر ایک نے مجھے طرح طرح کی حفاظتی تدابیر کے مشورے دیئے ہیں اور نصیحتیں کی ہیں۔ دو دنوں سے مسلسل آگ جل رہی ہے اور ابھی تک اسے بجھانے کے لئے کوئی نہیں آیا۔ اب آگ کا سمندر چاروں طرف پھیل چکا ہے اور میرے گھر کے سامنے سڑک پر بے پناہ ہجوم جمع ہو رہا ہے، لوگ کاروں، سائیکلوں اور سکوٹروں پر کالونی کے اندر آ رہے ہیں'' وہ کافی دیر سے خاموشی سے آگ کے سمندر کو دیکھ رہے ہیں۔ میں نے بیتابی سے

ایک سکوٹر سوار سے پوچھا ہے۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا ہے کہ ہماری کالونی میں آگ لگ گئی ہے؟"

"جناب سارے شہر میں خبر پھیل گئی ہے"۔ سامنے قیامت کی آگ جل رہی ہے اور لوگ دیکھ رہے ہیں، سب کسی کے منتظر ہیں، انہیں توقع ہے کہ چند لمحوں میں فائر بریگیڈ آئے گا اور معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔ آگ پھیلتی جا رہی ہے اور پاور ہاؤس کے قریب کے مکان آگ کی لپیٹ میں آنے والے ہیں، ان کے مکین یہاں سے بھاگ گئے ہیں۔

"ابھی تک فائر بریگیڈ نہیں آئی"

"یہ تب آئے گی جب شہر راکھ ہو جائے گا"۔ ایک شہری نے جواب دیا ہے۔

"دو گھنٹوں سے ٹیلیفون کیا جا رہا ہے لیکن ان کا ٹیلیفون خراب ہے، ایک لڑکا سکوٹر پر فائر بریگیڈ کے دفتر گیا تھا وہاں کوئی نہیں ہے، فائر بریگیڈ کی لاریاں اسی طرح کھڑی ہیں"۔ یہ علاقہ سرکاری ملازموں کی رہائش گاہ ہے، بہت سے افسر اور ماتحت اپنے گھروں کے باہر ٹولیوں کی صورت میں فائر بریگیڈ کے منتظر ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا ہے۔

"گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔"

"بھائی میاں شعر تو وزن میں پڑھو۔"

"دلی والوں کے وزن گرتے ہی رہتے ہیں، یہاں بہن چود آگ لگی ہوئی ہے، شعر پڑھنے کی بجائے پانی کی بالٹیاں آگ پر ڈالو۔"

"جب یہاں پاور سٹیشن بننے لگا تھا تب میں نے فائل پر اس کی مخالفت کی تھی، یہ زمین ایک سرکاری افسر نے فراڈ سے حاصل کی تھی، اس نے مل ملا کر بجلی کے محکمے سے متنازعہ زمین کے اچھے پیسے کھرے کر لئے تھے"۔

"ڈیم اٹ یہ ملک اسی طرح چلے گا لیکن ابھی تک انتظامیہ کا کوئی افسر موقعہ پر

نہیں آیا؟"۔

"آکر کیا کرے گا؟ اور آگ بھڑکائے گا"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں تو لوگوں کے ہجوم میں سر سراہٹ بلند ہوئی۔
- کمشنر اور آئی جی آگئے ہیں"۔ ان کے ساتھ لمبی لمبی کاروں کا جلوس ہے۔
کاروں میں سوار بڑی پھرتی سے باہر نکلے ہیں' سب موقعہ دیکھ رہے ہیں' ایک وردی پوش موقع کا نقشہ بنانے لگا ہے۔ ہجوم میں سے کسی نے زور سے نعرہ لگایا ہے

"موقعہ ملاحظہ سے کیا فائدہ؟ دو دنوں سے فائر بریگیڈ کہاں ہے' ہم شہری کس بات کا ٹیکس دیتے ہیں؟" ایک نے زور سے کہا ہے۔

"کارپوریشن والے کہاں ہیں؟ شہر جل رہا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے"۔

"اس شہر کا جل ہی جانا چاہیے جہاں ۲۴ گھنٹے قیامت کا سماں رہتا ہے"۔ آگ اسی طرح جل رہی ہے۔ حکام موٹروں میں سوار ہو کر چلے گئے ہیں' لوگ بھی آہست آہستہ کھسکنے لگے ہیں۔ اتنے میں یکے بہ دیگرے دو فائر ہوئے ہیں "پکڑ لو. پکڑلو. چور چور" کالونی کی طرف سے شور بلند ہوا ہے اور اندھیرے میں لوگوں کے بھاگنے کا شور واضح طور پر سنائی دے رہا ہے۔ ایک دن بعد فائر بریگیڈ موقع پر آئی جب پاور ہاؤس اور دو مکان راکھ ہو چکے تھے' اخباروں نے اس لاتعلقی پر کافی شور مچایا ہے لیکن اس کے باوجود کچھ نہیں ہوا' البتہ تفتیش شروع ہو گئی ہے کہ آگ تخریب کاری کا نتیجہ تھی یا محض اتفاقیہ تھی۔

آج پانچواں دن ہے میرے گھر میں بجلی پانی نہیں ہیں میں باہر جاتا ہوں تو کسی ہوٹل یا دوکان سے پانی کا گلاس پی آتا ہوں' عجیب بات ہے کہ جونہی میں پانی پیتا ہوں مجھے پیاس بھڑک اٹھتی ہے اور پہلے سے بھی زیادہ پانی پینے کو جی چاہتا
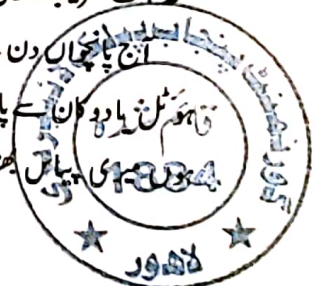
ہے۔ اگر اسی طرح پیاس بڑھتی گئی تو پھر کیا کروں گا۔؟ میں نے اپنے گھر والوں سے رابطہ کیا ہے. انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ جب پانی آئے گا تو وہ پھر واپس آئیں گے۔ پانی کے آنے کے لئے بجلی شرط ہے' بیسوں مرتبہ گرڈ سٹیشن جاچکا ہوں لیکن وہاں ٹیلیفون میز پر اوندھا پڑا ہوتا ہے اور ہال میں کوئی شخص موجود نہیں ہوتا' ٹیلیفون کے پاس ایک بڑا سا کتا سویا ہوتا ہے' میں خاموشی سے گھر واپس آجاتا ہوں۔ بار بار گھر کے نلکے کھولتا ہوں لیکن کسی کے دہانے سے پانی کی بوند تک نیچے نہیں گرتی اور میں برتن اٹھا کر اس کالونی سے باہر پانی کی تلاش میں نکل جاتا ہوں۔ بجلی آئے گی تو پانی آئے گا' دونوں ایک ہی رشتے میں بندھے ہوئے ہیں اور مجھے روزانہ دونوں میں سے ایک کی تلاش میں جانا ہے۔

ایک کہانی

دفتری زندگی کے بارے میں دو طرح کے خیالات ہیں۔ بہت سے لوگ اس خیال کے حامل ہیں کہ دفتر ایک نشہ ہے' کرسی خواہ چھوٹی ہو یا بڑی' اس میں بیک وقت نشہ اور لذت ہوتی ہے۔ اس کی حمایت میں یہ بھی کہا جاتا ہے' چلو تنخواہ تھوڑی ہی سہی' ایک تحفظ تو ہوتا ہے' بیماری کا مفت علاج اور پینشن۔ دوسرے یہ کہتے ہیں کہ دفتری زندگی ایک غلامی ہے' کولہو کا بیل' تھوڑی سی تنخواہ' ہر طرح کی آزادی سلب' ایک دوسرے کے خلاف سازشیں اور ہر وقت مفت مراعات حاصل کرنے کی خواہش' افسروں کی طرف سے کی جانے والی توہین' اس کے عوض محدود سا اختیار۔ سب سے بہتر آزاد پیشہ ہے۔ محنت کرو تو پیسہ بھی مل جاتا ہے' جو من میں آئے کرو' یہ ساری باتیں اس کے دماغ میں گھوم رہی تھیں۔ وہ جن دفتروں سے اٹھ کر یہاں آیا تھا وہاں فرنیچر اور اہلکار سب خستگی کا شکار تھے۔ لیکن اس کے باوجود یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ زندگی کی رو سے باہر نکل گیا تھا۔ اس دفتر میں ہر چیز سجی سجائی تھی۔ ایک بڑا سا ائر کنڈیشنڈ کمرہ' دیوار سے دیوار تک قالین' کشادہ سٹیشنری سے سجی ہوئی شیشے کی میز' پرائیویٹ سیکرٹری وغیرہ' اسے یہاں ترقی پر بھیجا گیا تھا' یہ ایک نیم پرائیویٹ ادارہ تھا جس کے کمروں کے اندر آنے سے پہلے دروازے پر بڑے سلیقے سے ہلکی سی دستک دی جاتی۔

ایک دو دنوں تک افسروں اور ماتحتوں کے تعارف اور ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ فریقین واضح طور پر یا اشاروں سے اسے ایک دوسروں کے ویک پوائنٹس بتاتے رہے۔ وہ گھاک قسم کا افسر تھا جو اہلکاروں کو ان کے حلیوں اور شکلوں کی بجائے ان کے لب و لہجہ' عادات' حرکات و سکنات اور ان کی تہہ میں مخفی اضطراب کے ذریعے پہچاننے کی کوشش کرتا۔ چنانچہ اس نے تین چار دنوں میں اپنے ذہن میں ہر اہم افسر کی فائل تیار کر لی تھی۔ اس نے مزید تین چار دن لگا کر اس ادارے کے نظم و نسق اور کارکردگی کے بارے میں سیر حاصل تفصیلات حاصل کر لیں۔ اس کی حیثیت اس ادارے میں نمبر ۲ کی تھی۔ لیکن نمبر ۱ کا کمرہ ہمیشہ بند رہتا کیونکہ اس جگہ کوئی نمبر ۱ آنا نہیں چاہتا تھا۔ اس ادارے کے جملہ امور ایک ایسے نمبر ۱ کو دے دیئے گئے جو کسی اور دفتر میں کام کرتا تھا۔ نمبر ۱ کا اس ادارے سے رابطہ کاغذوں کے ذریعے تھا۔ اس لئے عمارت کی تین فلورز پر نمبر ۲' نمبر ۱ کے طور پر کام کرتا تھا۔

دوسرے دن ہی اس نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری سے لے کر افسروں تک سب کو باری باری بلایا لیکن ایک بجے تک کوئی بھی دفتر نہیں آیا تھا۔ اس نے غصے میں آ کر سب کی جواب طلبی مانگی۔ پچھلے پہر اسے ایک زرد کاغذ پر بجلی کی ٹائپ پر نہایت نفاست سے چھپی ہوئی یہ تحریر آئی۔ جواب طلبی کا اختیار نمبر ۱ کو ہے۔ اس نے بیحد خفت محسوس کی۔ اور اپنے اختیارات کے بارے میں استفسار کیا۔ پہلی مرتبہ زرد رنگ کے کاغذ پر جواب آیا تھا' اس مرتبہ گلابی کاغذ پر بجلی کے ٹائپ پر لکھا ہوا جواب آیا۔

"اس ادارے کے ضابطہ میں آپ کو کسی بات کا اختیار نہیں ہے۔

"ڈیم اٹ تو پھر کسے اختیار ہے؟"

"جو اس ادارے کو چلاتا ہے" اس کے پرائیویٹ سیکرٹری نے کہا۔

"وہ کون فرشتہ یا شیطان ہے؟"

اس کا پرائیویٹ سیکرٹری اردو اور انگریزی کے اخبارات اور ٹائمز میگزین میز پر رکھ کر دبے پاؤں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس کی عمر بھر کی عادت عین وقت پر دفتر پہنچنا تھا۔ وہ ہفتے میں چھ دن برس ہا برس اس روٹین کی سختی سے پابندی کرتا رہا۔ ملازمت کی اس منزل پر پہنچ کر اسے دفتر وقت پر آنے میں کوئی پابندی نہیں تھی' لیکن وہ اپنی عادتوں کا غلام تھا' اور ہمیشہ ان کی پابندی کو زندگی کا ناگزیر حصہ سمجھتا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو گھر میں صبح کے دو تین گھنٹے بیوی بچوں کے ساتھ بسر کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے بچے عمر کی اس منزل پر تھے جہاں وہ اس سے علیحدگی چاہتے تھے۔ دفتر میں کام آنے والوں کی بھی خصوصی عادتیں ہوتی ہیں۔ بعض بیحد مصروف ہوتے ہیں۔ جب وہ کام سے عاری دفتروں میں بھیجے جاتے ہیں تو ان کا حال خراب ہوتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح کے دفتر میں بھیجا گیا تھا۔

پہلے ہفتے اس نے دفتر میں بڑی مستعدی دکھانے کی کوشش کی لیکن اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ دن بھر میں ایک یا دو کاغذ اس کی میز پر آتے تھے۔ اگر یہ بھی نہ آتے تو اس کی مصروفیت میں فرق نہ پڑتا۔ دوسرے ہفتے اس کے پرائیوٹ سیکرٹری نے کمرے کے قد آدم دریچوں سے پردے کھینچ کر اسے کہا۔

"سر وہ دیکھیے پارک میں جھیل ہے' طبیعت بوجھل ہو تو اس نظارے سے دل بہل جاتا ہے' آپ کے پیشرو گھنٹوں یہاں کھڑے نظارہ کیا کرتے تھے"

"لیکن وہ کام کس وقت کرتے تھے" اس نے متانت آمیز غصے سے کہا۔

چند ہی دنوں میں اس کی مستعدی پہلے کی نسبت کافی کم ہو چکی تھی۔ اس نے ایک دو دفعہ دفتر کے کمروں کا راؤنڈ بھی لیا۔ اکثر اہلکار اپنی نشستوں سے غائب تھے جو موجود تھے ان میں سے اکثر میزوں پر سر رکھے ہوئے سو رہے تھے۔ یہ

صورتحال اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اس نے ایک دو مرتبہ نمبرا سے ٹیلیفون پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن ہمیشہ آگے سے یہی جواب ملتا

"صاحب ہاٹ لائن پر بات کر رہے ہیں۔"

نمبرا سے بات کرنے اور اس اس ناقابل فہم صورتحال کی اطلاع دینے کا اشتیاق بتدریج ختم ہوتا گیا۔

ایک دن اس نے حسابات وغیرہ چیک کئے تو اس نے بیساختہ کہا۔۔

"اتنے زیادہ اخراجات کہاں ہو رہے ہیں۔ یہاں کوئی کام تو ہے نہیں۔" ایک ماتحت نے جواب دیا۔

"جناب کام ہے لیکن ہمیں کرنے کی اجازت نہیں' پالیسی بدل گئی ہے"

"کیسی پالیسی؟ مجھے بھی پتہ چلایا جائے"

"جناب ۴ سال سے یہ حکم ہوا ہے کہ اس ادارے کو بند کر دیا جائے لیکن یہ بند نہیں ہو سکا۔"

"اسے بند کس نے کرنا ہے؟"

"جنہوں نے اسے بنایا ہے"

اس نے حیرت سے اپنے ماتحت کی طرف دیکھا جو اس کے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے دریچے میں سے پارک میں بنی ہوئی جھیل کا نظارہ کر رہا تھا۔

"جناب آپ سے پہلے بھی کوشش کی گئی ہے' لیکن یہ ادارہ بند نہیں کیا جا سکا۔"

"کون سی رکاوٹ ہے' جب فیصلہ ہو چکا ہے" اس نے تنگ مزاجی سے کہا۔

"تم لوگ مفت کی تنخواہیں لے رہے ہو' یہ ادارہ بیمار ہے اور تم سب اس میں مریض ہو' جاؤ مجھے کام کرنے دو"۔

اس کا ماتحت برا سامنہ بنا کر باہر نکل گیا۔

"بھاڑ میں جائیں یہ سارے' میں نے کون سا یہاں بیٹھے رہنا ہے" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ دن میں دوسری مرتبہ اخبار پڑھ کر اس نے میز کے دراز کھولے' پھر بند کئے' ایک دو فضول قسم کے ٹیلیفون کئے اور دریچے میں کھڑا ہو کر ایک کھلے پارک میں چپاں نیلگوں جھیل کا نظارہ کرنے لگا۔ پھر اس نے تیسری دفعہ کافی منگوائی۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے ایک سابقہ رفیق کار کے لئے ٹیلیفون ملایا جس نے مختصری بات کر کے ٹیلیفون بند کر دیا۔

"ڈیم اٹ' کبھی تو ریسیور پندرہ بیس منٹ تک نہیں چھوڑتا تھا' اب کٹ شارٹ کرتا ہے۔"

وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ایک دم جھٹکے سے ایئر کنڈیشنگ پلانٹ چلتے چلتے رک گیا اور ایئر ٹائیٹ کمرے میں حبس بڑھنے لگا اور اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ اس نے ٹیلیفون کا بزر دے کر اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو بلایا۔

"یہاں تازہ ہوا کی کمی ہے۔"

"جی ہاں"

"اس کا کیا بندوبست ہے' ہوا کی کمی کی وجہ سے یہاں کے اہلکار بیمار ہیں۔ یہ بیمار دفتر ہے" اس نے غصے سے پاؤں قالین پر مارا اور پرائیویٹ سیکرٹری گھبرا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک مہنے کے بعد اس نے اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کی۔ وہ صبح دفتر آتے ہوئے ڈرائیور کو پبلک لائبریری کی طرف جانے کے لئے کہتا۔ وہ نصف گھنٹہ تک ریڈنگ روم میں رسالوں کی تصویریں دیکھتا رہتا۔ پھر لائبریری کی سیڑھیوں پر کھڑا آنے جانے والوں کا مشاہدہ کرتا۔ ڈرائیور کو وہ ٹولنٹن مارکیٹ پہنچنے کے لئے کہتا اور خود آہستہ آہستہ چلتا ہوا مارکیٹ پہنچ جاتا' وہاں رنگ دار چڑیوں کو غور سے

دیکھتا رہتا' ارد گرد سڑکوں پر اتنے زیادہ شور کے باوجود اس کے انہماک میں فرق نہ پڑتا۔ اس طرح وہ آٹھ بجے کی بجائے دس بجے دفتر پہنچتا۔ سرسری طور پر بے دلی سے ایک آدھ اخبار پڑھتا۔ کافی پیتا اور دو تین گھنٹے جھیل کا نظارہ کرتا رہتا۔ کبھی وہ دفتر کی میز پر بڑا مستعد ہو کر بیٹھ جاتا' پھر اٹھ کر' صوفے پر لیٹ جاتا۔ اگر ذرا سی کھٹک ہوتی تو اٹھ کر بیٹھ جاتا۔

"اگر یہ واقعی گیم آف پیشن ہے تو مجھے یہ گیم کھیلنی چاہیے" وہ جیب سے تاش نکال کر دفتر کی میز پر اس گیم میں مصروف ہو جاتا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھا پاؤں اونچے کر کے گھوماتا تو کرسی کے ساتھ اس کا سر اور چھت گھومنے لگتے۔

اس دفتر میں تیسرے مہینے یہ محسوس کیا کہ اس کے اعصاب میں تندی و تیزی ختم ہو چکی تھی۔ اس کا لب و لہجہ دھیمہ ہو چکا تھا۔ اس نے اہلکاروں کو ڈانٹنا بند کر دیا تھا' وہ اب کسی کے کام میں دخل نہ دیتا البتہ دن میں تین مرتبہ وہ اپنے پرائیویٹ سیکرٹری سے انٹرکام پر پوچھتا۔

"اس ادارے کے بند کرنے کے بارے میں کوئی حکم؟"

"جی نہیں"

اس کا پرائیویٹ سیکرٹری ہمیشہ یہی جواب دیتا۔

"ہمیں کام دینا ان کی ذمہ داری ہے اور کرنا ہمارا فرض ہے' اس میں ہمارا قصور کیا ہے"

"یس سر ہم سب یہی کہتے ہیں"

ایک دن حسب معمول اس نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری سے پوچھا

"کوئی حکم ملا ہے؟"

"یس سر' ابھی اطلاع آئی ہے کہ یہ ادارہ اسی صورت میں چلتا رہے گا"

"گڈ" اس نے کہا اور ماتھے کو ہتھیلی سے چھوا۔

"اوہ میں کچھ بیمار لگتا ہوں"

اس نے نبض پر انگلی رکھ کر دل کی دھڑکن محسوس کی جو معمول کی نسبت بہت تیز تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ ٹیلیفون کرکے ادارے کے ڈاکٹر کو بلا کر پوچھے کہ اسے کیا ہو گیا تھا' بظاہر اسے کوئی عارضہ نہیں' وہ اپنی معمولات کو بڑی پابندی سے ادا کر رہا تھا۔ لیکن اس کا تجربہ کام آیا کہ دفتر میں کسی سے اپنی بیماری کا اظہار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اردگرد کے لوگ نئے آدمی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس نے اپنی بیماری کی تصدیق کے لئے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو بلایا۔

"صدیق تمہیں بخار تو نہیں ہے؟"

صدیق نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے ایئرکنڈیشنر زیادہ تیز ہے اس کی وجہ سے سردی لگ گئی ہو۔"

صدیق اسے بدستور حیرت سے تکتا رہا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بامعنی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ پرائیویٹ سیکرٹری کی نبض اس کی نبض سے بھی تیز تھی۔

مشکل آدمی

وہ لوگوں کے لئے آسان اور اپنے لئے مشکل ہے' اسے زندگی میں کوئی خاص دشواری نہیں ہے' وہ درمیانے درجے کا افسر ہے' اسے اپنے ادارے کی طرف سے ایک چھوٹا سا مکان ملا ہے جس میں اس کی ماں اور ملازم رہتے ہیں۔ شادی کے پانچ سال بعد اس نے اپنی بیوی کو اسی دن طلاق دے دی تھی' جس دن اس کی شادی ہوئی تھی' طلاق کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی' اس کی بیوی اس کی ماں کی خالہ کی بیٹی تھی' دونوں کے مزاج میں اختلاف تھا' وہ رات دیر سے گھر آتا' وہ اعتراض کرتی۔ ایک رات اس نے بیوی سے کہا تم ابھی تک مجھے نہیں سمجھ سکی' بیوی نے بھی یہی جواب دیا' اگلے دن ناشتے کی میز پر اس نے پھر اپنی بیوی سے کہا: اگر ہم ایک دوسرے کے لئے ناقابل فہم ہیں تو پھر ہمیں علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ اس کی ماں نے بھی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ اس کی بیوی اس کا تین سالہ بچہ بھی ساتھ لے گئی لیکن اس نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی' اس نے گھر کی ہر چیز پر حق جتایا' اس نے خاموشی کو ترجیح دی۔ ماں رو پیٹ کر خاموش ہو گئی اور زندگی کے معمولات اسی طرح چلتے رہے۔ ایک دو مرتبہ اس کی ماں نے اسے دوسری شادی کے لئے دبے لفظوں میں کہا' اس نے پھر جواب دیا: ماں' ہم ایک

دوسرے کو نہیں سمجھ سکتے۔"ہمیں سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے" اس کی ماں نے
اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

بیوی سے علیحدگی کے بعد وہ دیر سے گھر آتا ہے' ماں اور اس کا ملازم سو چکے
ہوتے ہیں' وہ خاموشی سے چٹخنی کھولتا ہے' اپنے کمرے میں جاتا ہے کپڑے بدل کر
چارپائی پر لیٹ جاتا ہے' سگریٹ پیتا ہے' ایک دم پلنگ پر بیٹھ جاتا ہے۔ لیمپ جلا
کر وقت دیکھتا ہے' اس کے ذہن میں کوئی یاد نہیں' کوئی خواہش نہیں جو اسے
پریشان کرتی ہو' کبھی کبھار اسے اپنی دل کی دھڑکن رات کی خاموشی میں صاف
سنائی دیتی ہے' وہ اپنے آپ سے اور رات کے اندھیرے سے جدوجہد کرتا ہوا سو
جاتا ہے' صبح اٹھ کر پھر اپنے معمولات کا آغاز کرتا ہے جن کا وہ اسیر ہو چکا ہے'
شام کو وہ دیر تک اپنے دفتر میں بیٹھا رہتا ہے' کاغذات اور فائلوں سے نپٹتا ہے۔
شام ہو جاتی ہے اور اس کا قاصد باہر کرسی پر بیٹھا اونگھنے لگتا ہے' اس کی ڈیوٹی
میں ہر ایک گھنٹے کے بعد چائے بنانا شامل ہے' وہ بھی اس ڈیوٹی سے عاجز آ چکا ہے
لیکن اسے یہ تسلی ہے کہ شام کو زائد ڈیوٹی ادا کرنے کے عوض پانچ روپے مل
جاتے ہیں۔ اس کے دفتر والوں کا خیال ہے کہ وہ بہت محنتی ہے اس لئے وہ شام
تک کام کرتا ہے' وہ مسکراتا ہے یہ سب مجھے نہیں سمجھ سکتے۔ میں گھر جا کر کیا
کروں گا؟ اس لئے یہاں بیٹھنا بہتر ہے۔ شام کو جب دفتر میں کوئی کام نہیں ہوتا'
وہ میز کی دراز سے عمدہ قسم کی تاش نکال کر کوئی نئی گیم بنانے میں محو ہو جاتا ہے'
سامنے دیوار سے چپکا کلاک ہر نصف گھنٹے کے بعد اپنی موجودگی کا اعلان کرتا ہے۔
وہ سگرٹ پہ سگرٹ پیتا جاتا ہے اور تاش کے پتے سے پتا جوڑتا جاتا ہے' باہر
اندھیرا چھا جاتا ہے اور وہ پسینے سے شرابور کمرے سے باہر نکلتا ہے' تاش کے پتوں
کو اپنے دفتر کی میز پر جوں کا توں چھوڑ دیتا ہے۔

وہ اپنے پرانے دفتر میں خوش تھا' ایک دو کولیگز سے دوستی تھی' دن بھر کام

کاج اور گپ شپ میں گزر جاتا' بات چیت دفتری معاملات تک ہی محدود رہتی'
اس کے کولیگز اکثر پروموشن اور تنخواہوں کے سکیلوں پر بات کرتے' وہ خاموش
رہتا "یار تم کیوں نہیں بولتے؟ تمہیں پروموشن نہیں چاہیئے" وہ مسکرا کر خاموش ہو
جاتا۔ اس کے کون سے بیوی بچے ہیں جو اسے پروموشن چاہیئے؟ وہ حسب معمول
مسکراتا رہتا۔ اس کے دفتر والے اس کی خانگی حالات سے واقف نہیں ہیں کیونکہ
وہ دفتر میں اپنی خانگی زندگی کا ذکر کرنے سے گریز کرتا ہے۔ "تمہیں مستقبل
کی کوئی فکر نہیں۔ خواہ مخواہ اپنی پروموشن چھوڑ دی۔" "ہاں میرا ہر دن میرا
مستقبل ہے جسے میں بسر کرتا ہوں' مجھے اپنا تبادلہ منظور نہیں ہے' اس لئے میں
نے اپنی پروموشن بھی چھوڑ دی ہے۔" "تمہاری منطق عجیب ہے' ملازمت کرتے
ہوئے بھی مستقبل سے انکار کرتے ہو" اس کے دوسرے کولیگ نے اسے
سمجھانے کی کوشش کی وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھنے کا بہانہ کرتا۔
"میری تنخواہ میری حیثیت' ضرورت' خواہش کے عین مطابق ہے۔" اس کے
کولیگز زیادہ بحث کرنے کی بجائے اپنی اپنی فائلیں اٹھا کر اپنے اپنے کمروں میں
چلے جاتے۔

اسے یکایک ایک نئے دفتر میں تعینات کر دیا گیا ہے' اسے اپنی تعیناتی پر حیرت
ہوئی ہے کہ نئی جگہ اس کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ اس نے ایک دو کولیگز سے
اس غیر معمولی تعیناتی پر حیرت کا اظہار کیا ہے' ایک نے معنی خیز مسکراہٹ سے
جواب دیا ہے۔ "اس دفتر کا پہلا افسر بیٹھے بیٹھے حواس کھو بیٹھا تھا۔" اس نے کہا
"اس میں عجیب بات کیا ہے؟" اس کے کولیگ نے کسی قدر سنجیدگی سے جواب دیا۔
"اس کے پیشرو نے خودکشی کی تھی۔" "خودکشی" اس نے زیر لب کہا اور کمرے
سے باہر نکل گیا ہے۔ اس نے اپنے دفتر سے باہر ادھر ادھر دیکھا ہے' اسی عمارت
کے احاطے میں کافی دور ایک گوشے میں ایک سفید گنبد ہے جس کے چاروں

طرف چھوٹی چھوٹی محرابیں ہیں' محرابوں کے گرد نیلے رنگ کے حاشیے اور محرابوں کے اندر بجھتے ہوئے رنگیں بیل بوٹے ہیں۔ یہ عمارت زمین سے چار فٹ اونچے ایک چبوترے پر ہے۔ چبوترے پر تازہ گھاس ہے اور گھاس کے اندر چھوٹی اینٹ کی روش اور روش پر ہر دو قدموں کے بعد چھوٹی اینٹوں پر سنگ مر مر کے ستارے' عمارت کے اندر قدم رکھتے ہی ایک مرطوب سی خنکی' ایک کسیلی سی مہک جو پرانی کتابوں کے صفحوں میں سے اٹھتی ہے یا قبرستانوں میں بھٹکتی رہتی ہے۔

اس کا نیا دفتر ایک عجیب و غریب سا دفتر ہے' اس کا کام بھی کچھ غیر واضح ہے' اس کا کام پرانی دستاویزات کی حفاظت ہے' وہ دستاویزات' وہ کاغذات جن میں زمانوں کے راز ہیں' وہ کاغذات' وہ دستاویزات جن پر لاکھ کی مہریں' سرخ ربن' اور ابھری ہوئی مہریں لگی ہوئی ہیں جو موسموں کے ساتھ زرد اور بے رنگ ہو چکی ہیں' ان کی حفاظت کے لئے اسے اس مقبرہ نما عمارت میں بھیجا گیا ہے۔ اس ہشت پہلو عمارت کی دیواروں پر آبنوسی رنگ کی لکڑی کے پینل لگے ہیں' دیواروں کے ساتھ موٹی ساخت کی براؤن رنگ کی الماریاں ہیں جن میں بہت ہی پرانی کتابیں ہیں جن کی پشت پر دیمک اور سفید چیونٹیوں کے قافلے آہستہ آہستہ سفر کرتے ہوئے مختلف اقلیدسی اشکال بناتے ہوئے معدوم ہو جاتے ہیں۔
ایک مدور ہشت پہلو ہال اندرونی محرابوں سے چھوٹے چھوٹے کمروں میں تقسیم ہے' ہر کمرے کے باہر لکڑی کے فریم ہیں جن میں بہت سے سفید فاموں کے فرمان' فوجی اور دفتری لباس میں تصویریں ہیں' ہر کوئی اپنی تصویر میں اکڑا ہوا ہے' یہ تصویریں وقت کے ساتھ مدہم ہو چکی ہیں۔ اس ہشت پہلو عمارت کی دیواروں پر مختلف عہدوں کے ہتھیار کیلوں سے شیلڈوں پر پیوست ہیں' ایک زرہ بکتر ایک شوکیس میں معلق ہے' اس کا سر غائب ہے' بہت سے فرمان شو

کیسوں میں بند ہیں' ان کے اوپر فنائل کی گولیاں ہیں۔ ایک گوشے میں پرانے اخبار پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ ہشت پہلو عمارت جس شہر میں واقع ہے اس کی عہد بہ عہد تصویریں شہر کی موجودہ حالت کو ناقابل یقین بنا رہی ہیں۔
اس کا دفتر ایک محراب کے نیچے ہے جس کے باہر دروازہ نصب کر کے اسے مرکزی ہال سے علیحدہ کیا گیا ہے' کمرے کا سائز 12 X 8 فٹ ہے۔ دو طرف دیواروں پر لکڑی کی چھوٹی چھوٹی بیشمار الماریاں ہیں جن کے پیتل کے تفلوں پر زنگ جما ہوا ہے۔ کمرے میں ایک دبیز لکڑی کی چمکتی ہوئی پرانی میز ہے اور اس کے پاس اسی ساخت کی دریدہ اور بے رنگ چمڑے کی کرسی ہے۔ اس کے کمرے بالکل مرکزی ہال کے ایک گوشے میں محراب کے نیچے ایک سنگ مرمر کا تعویذ ہے جس کے ساتھ کتبے پر بہت سی عبارتیں لکھی ہیں' اس عمارت میں انٹر فلور اور غلام گردشیں بھی ہیں جہاں قدیم ریکارڈ سے بھری ہوئی الماریاں اور ویران میزیں ہیں جن کے پاس ایک نگہبان سٹول پر بیٹا غنودگی میں ہے۔ عمارت کے اندر کسی گوشے سے کچھ وقفے کے بعد ٹائپ کرنے کی آواز آتی ہے۔ کل عملہ ایک کلرک' ایک سٹینو اور ایک نائب قاصد پر مشتمل ہے جو عمارت میں اس طرح بکھرا ہوا ہے کہ ان کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا' البتہ کلرک ہر نصف گھنٹے کے بعد عمارت کے اندر چکر لگا کر دیکھتا ہے کہ ہر کاغذ اور ہر چیز اپنی اپنی جگہ موجود ہے' چکر لگانے کے بعد اسے یقین ہو جاتا ہے کہ تمام دستاویزات' ہتھیار اور فرمان وغیرہ اپنی اپنی جگہوں پر اسی طرح موجود ہیں جس طرح انہیں ایک صدی پہلے سجایا گیا تھا۔

ایک ہفتہ ہو چکا ہے اور وہ ابھی تک اپنے عملے سے مانوس نہیں ہوا ہے' صرف نائب قاصد اس کی قربت حاصل کر چکا ہے۔ اس نے ادھر ادھر سے اپنے کام کی نوعیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سب نے

یہی بتایا ہے کہ اس کا کام دستاویزات کی حفاظت کرنا ہے۔" لیکن یہ سب دستاویزات وقت سے بہت پیچھے رہ گئی ہیں' اس نے چیخ کر عملے کے ایک رکن سے کہا تھا۔ وہ سارا دن وقفوں کے بعد اخبار پڑھتا ہے۔ سامنے میز پر رکھا ہوا ٹیلیفون بالکل خاموش رہتا ہے۔ وہ بھی کسی کو ٹیلیفون نہیں کرتا' ایک دو مرتبہ پچھلے ادارے کے ایک دو کولیگ آئے تھے' اس کے بعد کوئی ملاقاتی بھی اس کے کمرے میں نہیں آیا۔ وہ نصف دن تک اخبار پڑھنے کے بعد مرکزی ہال میں چکر لگاتا ہے۔ ہر تصویر کو بڑے غور سے دیکھتا ہے۔ تصویر کے ساتھ ہی وہ واقعات اس کے ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں جو اس تصویر سے منسلک ہیں' چند دنوں کے بعد وہ تصاویر سے بیزار ہو گیا ہے۔ "خبیث کے بچے' وہاں کوئی مالی تھا یا نائی کا بیٹا تھا' تاریخ نے انہیں ہزہائینس بنا دیا ہے" اس نے مختلف زمانے کی درخواستوں کا مطالعہ شروع کیا ہے! اوہ' اب بھی سب کچھ وہی ہے' کیلنڈر پر صرف تاریخ بدلی ہے' اس نے تاریخ میں ایم اے میں گولڈ میڈل حاصل کیا تھا لیکن پندرہ سال کی ملازمت میں تاریخ بھول چکا ہے اور اسے صرف کیلنڈر کی تاریخ یاد رہتی ہے' کیونکہ اسے دو تاریخ کو تنخواہ ملتی ہے اور وہ تنخواہ کا کچھ حصہ اپنی سابقہ بیوی اور بچے کو بھیج دیتا ہے' یہ عدالت کا فیصلہ ہے' وہ اپنے مصارف میں تنگی محسوس کرتا ہے لیکن اسے برداشت کرتا ہے کہ اس کا زندگی کے بارے میں کوئی منصوبے نہیں ہے' کوئی امنگ نہیں ہے۔ "میں صرف زندہ رہنے کے لئے زندہ ہوں" ایک دن اس نے تنگ آکر اپنی ماں سے کہا تھا۔ "میں اس سے بڑھ کر اور کیا کر سکتا ہوں؟" شاید میں نے یہی کچھ کرنے کے لئے جنم لیا ہے' زندہ رہنے کے لئے کچھ کرنا ضروری ہے۔" اس کی ماں اس کی بات نہ سمجھ سکی اس کا کوئی بہن بھائی نہیں ہے جو اس کی ماں کے کہنے پر اسے سمجھاتا"۔ تم اپنے خول سے باہر نکلو' لوگوں سے میل ملاقات کرو' زندگی بڑا خوبصورت تحفہ ہے۔" اس کے دفتر کے

باہر ایک اتفاقی ملاقات کے دوران ایک پرانے دوست نے اسے نصیحت کی تھی عجیب احمق لوگ ہیں' میں کسی کو مشورہ نہیں دیتا' کسی کو نصیحت نہیں کرتا' مجھے خواہ مخواہ ایک بچے کی طرح سمجھاتے ہیں' یہ کیوں نہیں جانتے کہ یہاں ہر ایک دوسرے کے لئے رکاوٹ ہے۔ ہر ایک دوسرے کی مشکل ہے' اس لئے ایک دوسرے کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اس نے ایک مرتبہ اپنی بیوی سے احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا۔

دو ہفتوں میں ہی اس نے محسوس کر لیا کہ وہ اس تعیناتی کی بدولت ہر ایک سے کٹتا جا رہا ہے' اسے باہر نکلنا چاہئے' اپنی بہتری کا منصوبہ بنانا چاہئے' لیکن اس کے لئے معقول رقم درکار ہے یہ کہاں سے آئے گی؟ اس نے دفتر میں بیٹھے بیٹھے اپنی میز پر فیصلہ کن انداز میں مکا مارا۔ وہ ایک دم اپنے کمرے سے باہر نکلتا ہے' مرکزی ہال میں جا کر قاصد کو باہر سے سگرٹ لانے کے لئے کہتا ہے' وہ ہال میں اکیلا ہے "عملہ کے دیگر افراد جا چکے ہیں۔ اس نے بڑی احتیاط سے چاروں جانب دیکھا ہے' وہ گنبد کے عین نیچے کھڑا تھا' اس نے سر اٹھا کر دیکھا ہے' تھوڑی دیر کے لئے اس کا سر چکرایا ہے اور آنکھیں دھندلا گئیں ہیں' "گنبد ذہن' گنبد مزار' گنبد افلاک" وہ زیر لب بڑبڑاتا ہے۔ اس نے سر جھٹک کر اپنے بدن کا توازن قائم کیا ہے' مرکزی ہال کے اندر دوہری محرابیں ہیں اور سب محرابوں میں تصاویر' مناظر اور مختلف ہتھیار آویزاں ہیں' وہ ساتویں محراب کے سامنے آکر رک گیا ہے' ساتویں محراب' ساتواں در' اس نے سگرٹ سلگایا اور سامنے آویزاں No smoking کی تختی کو ہاتھ مار کر الٹ دیا ہے۔ ساتویں محراب کے عین وسط میں دیوار پر ایک فریم میں سرخ مخمل پر ایک خنجر جڑا ہوا ہے۔ وہ اس کی موجودگی سے چونک اٹھا ہے۔ "یہ ابھی تک میری نگاہ سے پوشیدہ رہا ہے۔ میں نے محافظ خانے کا ایک ایک انچ دیکھا ہے۔ خنجر کا ہاتھی دانت کا دستہ ہے جس پر

سنہری حاشیہ نقش ہے۔ اس کا بلیڈ بے داغ ہے۔ اس کے عین وسط میں کچھ انگریزی حروف کندہ ہیں۔ تمام انگریزی حروف میں زنگ ابھر آیا ۔ہے۔ خنجر کے نیچے ساگوان کی سیاہ تختی پر سفید رنگ کی تحریر ہے:1613ایک انگریز سیاح کا تحفہ جو 250 سال تک ہر حکمران کی نیام میں رہا ہے۔" وہ ایک دم ٹھٹھک گیا ہے۔ نظام دین' نظام دین' اس نے زور سے آواز دی ہے' گنبد میں آواز کی بازگشت

نے اسے جواب دیا ہے' اس نے ایک دم سر اٹھا کر گنبد کر طرف دیکھا ہے جس کے نیچے وہ کھڑا ہے۔" نظام دین کہاں ہو ابھی تک سگرٹ نہیں لائے ۔ یہی آواز پھر گونجی ہے۔ ہشت پہلو ہال کے باہر گھاس پر مریل بیمار کتا بھونکنے لگا ہے۔ وہ سگرٹ کی خواہش میں اپنی میز کے دراز تلاش کر رہا ہے۔ "اس عمارت میں کوئی خاص بات ہیں ہے' میرا پیشرو ذہنی طور پر بیمار ہو گا اس لئے اوسان کھو بیٹھا۔ عمارت کا کیا قصور ہے؟ سب کچھ تو آدمی خود بناتا ہے۔ لیکن مجھے کس نے بنایا ہے؟ میرے ماں باپ نے' نہیں میں نے اپنے آپ کو بنایا ہے۔ نظام دین! نظام دین "اس نے ایک مرتبہ پھر آواز دی لیکن دو مرتبہ گونج سنائی دی۔" اوہ نہ جانے اس گنبد میں کس کس کی آواز قید ہے' فرانس سے بھاگے ہوئے جرنیل کی' نہیں یہ جھگڑے تاریخ کے ہیں اور میں تاریخ سے باہر زندگی بسر کرتا رہا ہوں۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ہال میں ٹہلنے لگتا ہے اور گھڑی دیکھتا ہے' اپنے بریف کیس میں کاغذات رکھتا ہے' اور گھر جانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے' باہر یکایک بجلی چمکنے لگی ہے۔ "اوہ یہ بارش' میرے پاس سواری بھی نہیں ہے' نظام دین' خود ہی دفتر بند کرے گا' یہاں لاکھوں کی دستاویزات ہیں یہاں تاریخ چوری ہو جائے گی' مجھے گھر جا کر کیا کرنا ہے؟ صرف سونا ہی ہے۔ تاریخی خنجر کوئی لے گیا تو مصیبت پڑ جائے گی۔ نہ جانے اس کے دستے پر کس کس کے ہاتھوں کی انگلیوں کے نشان ہیں؟ نہ جانے اس کا پھل کن بے خطا سینوں میں اترا ہو گا؟ مجھے اس سے کیا؟ وہ

سب جو اس خنجر سے گھائل ہوئے ہیں وہ تاریخ کا حصہ تھے' میں تاریخ سے باہر ہوں' اسے زہر میں بجھانے کی کیا ضرورت تھی' یہ خود زہر ہے۔ وہ ٹہلتا ہوا ایک پرانی سیاہ کرسی پر بیٹھ گیا ہے۔ باہر بجلی کی چمک کے ساتھ بادل بھی گرجنے لگا ہے اور ہشت پہلو عمارت کے پرانے شیشوں پر بارش کی لکیریں ڈراؤنی شکلیں بنا رہی ہیں۔ وہ ایک دم گھبرا کر کرسی سے اٹھا ہے' اوہ اس شیشے سے لارڈ کلایو جھانک رہا

ہے' نہیں دریائے ہگلی کا پانی خشک ہو چکا ہے' نظام دین نظام دین' روکو انہیں' جہاز آگے بڑھتے آ رہے ہیں' روکو' چاروں طرف سے فوجیں آگے بڑھ رہی ہیں' پنجاب فتح ہونے والا ہے میں ایسا نہیں ہونے دوں گا' وہ ایک دم جھپٹ کر خنجر کی طرف بڑھتا ہے اور اسے فریم سے باہر نکال کر ہوا میں لہرانے لگا ہے۔ ابھی تک میری زندگی تاریخ سے باہر رہی ہے لیکن میں تاریخ کے اندر ہوں' میں محافظ خانے کی حفاظت نہیں کر رہا' میں ان واقعات کو تاریخ بننے سے روک رہا ہوں' میں خود ایک واقعہ بننا چاہتا ہوں' زندہ رہنے کے لئے کچھ کرنا ضروری ہے' میں اس عہد کو ایک نئے حادثے سے بچا رہا ہوں۔ میں اس خنجر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے بدن کے اندر چھپا لوں گا۔

"صاحب! صاحب کیا کر رہے ہیں؟" نظام دین نے ہال کے دروازے سے چیخ کر کہا ہے "میں سگرٹ لے آیا ہوں" اس کا اپنے پیٹ کی طرف بڑھتا ہوا خنجر وہیں رک گیا ہے' وہ پسینے میں شرابور ہے' باہر موسلادھار بارش ہو رہی ہے۔" نظام دین ---" وہ کچھ کہنا چاہتا ہے نظام دین نے خنجر اس کے ہاتھ سے لے کر واپس دیوار پر آویزاں فریم میں نصب کر دیا ہے۔

"صاحب یہ زہر میں بجھا ہوا ہے' اور اسے اپنی جگہ سے اٹھانا منع ہے۔ آپ نے اسے کیوں وہاں سے نکالا' اپنے ہاتھوں کو صابن سے دھوئیں' اور غور سے

دیکھیں کہیں خراش تو نہیں آئی۔

وہ کھسیانی سے مسکراہٹ سے نظام دین کو دیکھ رہا ہے---- "نظام دین دفتر بند کرو۔ نظام دین بتیاں بجھا کر دروازے بند کرنے لگا ہے!

"صاحب یہاں رات اتنی دیر رہنا ٹھیک نہیں۔"

"کیوں؟"

"آپ سے پہلے جو صاحب تھے ان کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اسی گنبد کے نیچے، آپ یہاں سے تبادلہ کرالیں۔"

"کیوں؟"

"بہتر یہی ہے۔"

"کیا میرے بھی اوسان خطا ہو گئے ہیں؟" اس نے مسکرا کر نظام دین کی طرف دیکھا ہے جو بارش سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو چادر میں لپیٹ رہا ہے۔ نظام دین تیز بارش میں چبوترے سے اتر کر باہر جانے کے لئے مرکزی عمارت کے صحن میں غائب ہو گیا ہے۔

مختصر کہانی

دروازے کے دونوں پٹ ایک دوسرے سے کافی دیر تک سر پٹخنے کے بعد آہستہ آہستہ ساکن ہو گئے ہیں، ایک عورت ان کے درمیان سے گزر کر بھورے رنگ کے قالین پر اپنے جوتوں کے دبے ابھرتے نشان بناتی ہوئی سیاہ رنگ کی چرمی کرسی پر بیٹھ گئی ہے، ایک کشادہ کمرے کے وسط سے ذرا پیچھے ایک سیاہ رنگ کی وکٹورین عہد کی میز فائلوں کے انبار کے نیچے دبی ہوئی ہے، میز کے عین وسط میں شیشہ پھیلا ہوا ہے، شیشے کے نیچے کھبوں میں تقسیم ایک شبیہ کی تصویر ہے جس پر ایک فائل کھلی ہے، میز پر مختلف رنگوں کے مارکر اور بال پنسلیں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی ہیں، میز کی دائیں جانب سیاہ رنگ کی ایک ہشت پہلو اخروٹ کی میز ہے جس پر انگریزی اور فرانسیسی کے ناول رکھے ہوئے ہیں، کمرے کے عین وسط میں دھوئیں کا غبار معلق ہے اور تمباکو کی مہک پھیلی ہوئی ہے، دروازے کے دونوں پٹ پھر وا ہوتے ہیں، نیلے لمبے کوٹ میں ملبوس سر پر پگڑی باندھے ہوئے، بت کی طرح خاموش ایک طویل قامت شخص اندر داخل ہوا ہے، اس نے میز پر کافی کی پیالی رکھی ہے اور سر پٹخنے دروازوں سے باہر نکل گیا ہے، کافی کی پیالی سے بدستور بھاپ اٹھ رہی ہے میز کے پیچھے ایک پینتالیس سال کا آدمی عینک لگائے فائل پڑھنے میں پیہم منہمک ہے، اس کا سر فائل پر جھکا

ہوا ہے‘ اس نے میکانکی انداز میں کافی کی پیالی اٹھا کر عورت کے سامنے رکھ دی ہے۔

"آپ نے مجھے پہچانا ہے" عورت نے مسکراتے ہوئے کہا ہے‘ اس نے نظریں نیچی کرلی ہیں‘ شاید وہ پھر فائل پڑھنے میں مصروف ہو گیا ہے لیکن اس کا ذہن فائل پر ٹائپ شدہ لکیروں کی لاتعداد پٹڑیوں پہ چلتا ہوا نیچے اتر گیا ہے‘ اس نے پلکیں اٹھا کر عینک کے شیشوں سے ترچھی نگاہ سے پھر عورت کی طرف دیکھا ہے‘ وہاں ایک عورت کی بجائے شولڈر لینتھ بالوں والا ایک نوجوان بے صبری سے اپنے پیروں اور ہاتھوں کو ہلا رہا ہے‘ اس کی ترچھی نگاہیں وہیں ساکت ہو گئی ہیں۔

"تم کون؟"

"آپ نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا تھا" نووارد نے کارڈ اس کی طرف بڑھایا ہے‘ اس نے دور سے کارڈ دیکھ کر کہا ہے‘

"کارڈ پر نام پتہ درست معلوم ہوتا ہے لیکن میں دوسرا آدمی ہوں" نووارد شولڈر لینتھ بالوں کو جھٹک کر کھڑا ہو گیا ہے‘

"میں نے ناحق وقت ضائع کیا ہے‘ پہلے بتا دیتے آپ وہ نہیں ہیں‘ وہ یہ کہہ کر غصے سے باہر نکل گیا ہے‘ دروازے کے دونوں پٹ سر پٹخ رہے ہیں‘"

"یہ مجھے خود نہیں کہ میں وہ نہیں ہوں‘ اس نے انٹرکام کا بٹن دبا یا ہے۔

"یہ کون تھا؟ وہ ملنے پر کیوں مصر تھا؟ مجھے کیسی یاد دہانی کرانا چاہتا ہے‘ میں اسے نہیں جانتا ہوں‘ اگر وہ مجھے جانتا تھا تو یہ ضروری نہیں کہ میں بھی اسے جانتا ہوں‘ اس نے فائل پر پھر سر جھکا لیا ہے‘ کافی کی پیالی میں ایک مکھی پر پھیلائے ہوئے تیر رہی ہے‘ کمرے کے ایگزاسٹ فین نے کمرے کے عین وسط میں معلق دھوئیں کے غبار کو باہر نکال دیا ہے‘ اس نے سگرٹ سلگایا ہے اور کمرے کے عین وسط میں دھوئیں کی سیڑھی آہستہ آہستہ بلند ہو رہی ہے۔

ایک نامکمل سفر

اس سفر کے لئے ہم میں سے کوئی بھی آمادہ نہیں ہے لیکن ملازمت کی مجبوری ہے۔ ہمیں ۴۲ میل دور ایک دوسرے شہر میں سروے کے لئے جانا ہے۔ اس سروے کی نوعیت بھی کچھ غیر واضح ہے۔ یونیسکو کو ہمارے سربراہ نے آبادی کے بارے میں ایک رپورٹ بھیجنی ہے۔ ہم جس جیپ میں سفر کر رہے ہیں وہ پرانی ہے‘ سڑک ناہموار اور خطرناک قسم کی ہے‘ اندھا دھند لاریوں‘ ٹرکوں اور کاروں کی آمد و رفت ہے۔ ہم جیپ میں تین سوار ہیں اور چوتھا ڈرائیور ہے‘ سڑک بھی رات کی بارش کی وجہ سے کچھ چکنی ہے۔ اس لئے سفر خوشگوار نہیں ہے۔ جیپ کے اندر حبس ہے۔ ہم تینوں جیپ کے دریچوں سے بار بار منہ نکال کر باہر دیکھ رہے ہیں جیسے کسی چیز کے متلاشی ہوں۔ لیکن یہ مشغلہ بھی جلدی ختم ہو گیا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک باری باری اپنی رسٹ واچ اور جیپ کے سپیڈو میٹر کو دیکھ کر اندازہ لگاتا ہے کہ یہ سفر کتنے عرصے میں ختم ہو گا۔ اگرچہ جیپ پرانی ہے اس کے باوجود اس کی رفتار تیز ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے باری باری ڈرائیور کو آہستہ جیپ چلانے کے لئے کہا ہے۔ ڈرائیور نے ہم سب کو باری باری ترچھی نگاہوں سے تاثر کے بغیر دیکھ کر کہا ہے

"وہاں ہمیں شام سے پہلے پہنچ جانا چاہیے۔

"وہاں کوئی مسئلہ ہے...؟ ہم سب نے بیک زبان اور قدرے تشویش سے

پوچھا ہے۔ ڈرائیور نے جواب نہیں دیا۔ ہم میں سے ایک نے کہا ہے

"فاصلہ تو صرف ۴۲ میل کا ہے. شام کیسے ہو جائے گی؟" ڈرائیور نے پھر کوئی جواب نہیں دیا اور بڑے انہماک سے جیپ چلا رہا ہے۔ میں اور میرا ساتھی پچھلی نشست پر بیٹھے ہیں۔ ڈرائیور نے جیپ کے شیشے میں ہمارا عکس دیکھا ہے۔

"آپ خود ہی دیکھ لیں ہم کتنے بجے پہنچتے ہیں؟"

"یہ ڈرائیور کچھ خبطی لگتا ہے" میں نے آہستہ سے اپنے ساتھی سے کہا ہے۔

سڑک کے دونوں طرف وہی منظر ہے جو گذشتہ پچاس برسوں سے ہے' وہی بھینس' وہی کیکر کے درخت' وہی بوسیدہ لب سڑک لکڑی کے کھوکھے' یہ سب کچھ کب تک اسی طرح رہے گا؟

اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے ہمارے ساتھی نے کہا ہے۔ جیپ ایک دم مسلسل اچھلنے لگی ہے اور اس کے اندر ہم ایک دوسرے سے بری طرح ٹکرا رہے ہیں۔ سب نے یک زبان ہو کر دہائی دی اور محکمہ ہائیوے کو گالیاں دینے لگے ہیں۔ جیپ کا ڈرائیور مسلسل مسکرا رہا ہے۔

"یار یہ کیسی جرنیلی سڑک ہے' یہ سارا قصور شیر شاہ سوری کا ہے" اگلی شست پر بیٹھے ہوئے ساتھی نے کہا۔

"اس کے انجینئر بھی ہمارے محکمے کے ملازم تھے" ہم تینوں ہنسنے لگے ہیں۔

"یار وقت کتنا تیز رفتار ہے' کبھی اس سڑک پر شیر شاہ کی فوجیں مارچ کرتی ہوں گی اور اب اس کا کہیں نشان تک نہیں ہے" میں نے کہا۔

"یہ سڑک نہیں تاریخ ہے" میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے ساتھی نے کہا ہے۔

"تو کیا ہم تاریخ پر چل رہے ہیں؟" اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے ساتھی نے بات بڑھائی ہے۔

"یار تم لوگ تاریخ کو چھوڑو" دو گھنٹے بیت چکے ہیں لیکن وہ شہر دکھائی نہیں

دے "میں نے بیتابی سے کہا ہے۔

"مسٹر جیپ کا میلوں کا میٹر ٹھیک نہیں ہے؟" میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے ساتھی نے پوچھا ہے۔

"جی نہیں" ڈرائیور نے قدرے خشکی سے جواب دیا ہے۔

"تو پھر اس کا سپیڈو میٹر؟" میں نے پوچھا ہے

۔ "خود دیکھ لیں" ڈرائیور نے اپنے لہجے میں تبدیلی کئے بغیر جواب دیا ہے۔ ہم تینوں نے بیک وقت اپنی اپنی نشستوں سے قدرے اٹھ کر دیکھا ہے۔ سپیڈو میٹر اور مائیلو میٹر دونوں صفر پر ہیں۔

"اگر یہ دونوں صفر پر ہیں تو جیپ کیسے چل رہی ہے؟" میں نے ڈرائیور سے پوچھا ہے۔

"مسٹر سپیڈ تیز کرو" ہمیں شام کو واپس آنا ہے' یار میرے گھر میں میرے سوا اور کوئی میل ممبر نہیں ہے۔"

"اور تیز چلاؤ" ہم میں سے کسی اک نے کہا ہے۔

"کتنی تیز اور چلاؤں؟" ڈرائیور نے جواب دیا ہے۔

"جہاں تک ممکن ہے" میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے ساتھی نے کہا ہے۔

"ہر ممکن کی ایک حد ہوتی ہے" یہ جیپ اس سے تیز نہیں چل سکتی"۔

"اے مسٹر' جیپ کا انجن چل رہا ہے' پہیوں کے نیچے سے زمین بھاگتی جا رہی ہے لیکن اس کے باوجود فاصلہ ختم نہیں ہو رہا" اگلی نشست پر بیٹھے ساتھی نے کہا۔

"وقت بھی گزر رہا ہے' فاصلے اور وقت کا تعلق ہے" میرے پہلو میں بیٹھے ساتھی نے کہا۔ میں ان کی مہمل اور مضطرب باتیں سن رہا ہوں اور میرے دل میں بھی تشویش ہے۔ ہمیں روانہ ہوئے دو گھنٹے گزر چکے ہیں' جیپ کی دونوں طرف درخت' مکان اور کھیت بھاگتے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے ایک دم اپنے

ساتھی سے پوچھا۔

"تم نے فلسفہ پڑھا ہے؟"۔

"ہاں لیکن بھول گیا ہوں"۔

میں نے اگلی نشست پر بیٹھے ساتھی سے پوچھا۔

"تم نے فزکس پڑھی ہے؟"

"ہاں فزکس اور میٹا فزکس۔ دونوں' مگر دونوں بھول گیا ہوں"۔

مجھ سے نہ رہا گیا میں نے سب کو مخاطب ہو کر کہا ہے۔

"بھئی یہ کیا چکر ہے' ہم نے اچھے طریقے سے اپنے شہر کے دریا کا پل کراس کیا تھا' سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا' پھر یہ اچانک کیا ہوا' تم سب بہکی باتیں کر رہے ہو' اور سروے کو دیر ہو رہی ہے' فاصلہ ختم نہیں ہو رہا' وقت آگے بڑھتا جا رہا ہے' سڑک پر ٹریفک کے ہجوم میں اضافہ ہو رہا ہے۔"

"سر گھبرائیں نہیں' جب وقت اور فاصلے میں خرابی ہو جائے تو پھر ایسا ہو جاتا ہے" ڈرائیور نے اپنی منطق بگھاری۔ ہم تینوں ایک دوسرے سے لاتعلق ہو کر اپنا اپنا اخبار جھٹکے لیتی ہوئی جیپ میں پڑھنے لگے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد سب نے باری باری اخبار تہہ کر کے اپنی اپنی سیٹوں کی پشت پر رکھ دیئے ہیں۔

"اب اخباروں میں کیا رکھا ہے" اگلی شت پر بیٹھے ساتھی نے کہا۔ جیپ کے پہیے گھومتے جارہے ہیں اور ان کی نیچے سڑک بھاگ رہی ہے۔ ہم نے ایک دم محسوس کیا کہ جیپ سے باہر فضا میں ایک دم روشنی کم ہو گئی ہے' چاروں سمت سرمئی اندھیرا پھیل چکا ہے۔ میں نے رسٹ واچ دیکھی ہے۔ صبح کے بارہ بجے ہیں۔ ڈرائیور نے جیپ کی روشنی جلا دی ہے' آمنے سامنے روشنیوں کی یلغار ہے' گاڑیاں رینگ رینگ کر چل رہی ہیں۔ ڈرائیور نے سامنے سے آنے والے ٹرک ڈرائیور کو گالی دی ہے۔

والے آنکھوں کو اندھا کر رہا ہے" ہم نے جیپ میں سے سر باہر نکال کر آسمان کی طرف دیکھا ہے' روئی کے گالوں کا سمندر بہہ رہا ہے۔ موسم میں یکایک یہ تبدیلی کچھ غیر معمولی ہے جسے ہم سب نے محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو اور ایک دوسرے کو تسلی دی ہے کہ سورج کچھ عرصے کے بعد نکل آئے گا۔ جیپ کے پہیے بدستور گھوم رہے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد سڑک پر دھوپ چھاؤں کا کھیل شروع ہو گیا ہے۔ ڈرائیور نے ہیڈ لائیٹس بجھا دی ہیں۔ ہم تینوں نے ایک دوسرے کی طرف اطمینان سے دیکھا ہے۔ کافی دیر کے بعد سڑک کے دونوں طرف مانوس مناظر دکھائی دینے لگے ہیں۔ اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے ہمارے ایک ساتھی نے خوشی سے اچھل کر کہا ہے۔ "شہر آگیا ہے۔"۔

"ہاں رنجیت سنگھ کا شہر ہے' وہ آس پاس کے گاؤں میں پیدا ہوا تھا"۔

بھاڑ میں جائے' ڈرائیور جیپ تیز چلاؤ' ہمیں واپس شہر جانا ہے" میرے پہلو میں بیٹھے ساتھی نے بھنا کر کہا۔

جیپ ایک گول دائرے کے پاس رک گئی ہے۔

"اس شہر کو تین راستے جاتے ہیں' کس راستے سے چلیں" ڈرائیور نے پوچھا۔

"یار پہلے تو اس شہر کو یہی جرنیلی سڑک جاتی تھی" اگلی نشست پر بیٹھے ساتھی نے کہا

"یہ شہر بیمار ہے اس کی دائیں اور بائیں دو بائی پاس ہیں۔ کیونکہ اس کو مرکزی شریانوں میں رکاوٹ ہے" میں نے کہا۔

" یار کیا بات کر رہے ہو' ڈرائیور دائیں جانب کے بائی پاس کا راستہ لو' ہمیں سروے کرنا ہے' کل اسے رپورٹ نہ ملی تو وہ تبادلے کر دے گا' تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں' ہماری نشستوں پر قبضہ کرنے کے لئے ہزاروں تیار ہیں" میرے پہلو

میں بیٹھے ہوئے ساتھی نے کہا۔

"فاصلہ تو صرف ۴۲ میل ہے، شام کیسے ہو جائے گی؟"۔۔۔ ڈرائیور نے پھر کوئی جواب نہ دیا اور بڑے انہماک سے جیپ چلا رہا ہے۔ میں اور میرا ساتھی پچھلی نشست پر بیٹھے ہیں۔ ڈرائیور نے شیشے سے ہمیں دیکھا ہے۔

"آپ خود ہی دیکھ لیں ہم کتنے بجے پہنچتے ہیں؟

"یہ ڈرائیور کچھ خبطی لگتا ہے" میں نے آہستہ سے اپنے ساتھی سے کہا۔

ڈرائیور نے شہر کو جاتی سیدھی سڑک کو چھوڑ کر دائیں جانب کے بائی پاس کی طرف جیپ چلانی شروع کی کیونکہ سیدھی سڑک پر مخالف جانب سے اتنے ٹرک، گڈے، موٹریں اور ویگنیں فتح کے نشے میں چور لشکر کی طرح آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ یہ بائی پاس بھی عجیب طرح کا ہے، ایک لمبی بے مہار سڑک جس پر گاڑیوں کا ہجوم قدرے کم تھا۔ جیپ ڈرائیور نے سب کو اطلاع دی کہ اس بائی پاس سے شہر کو تین راستے جاتے ہیں اور ان میں کسی ایک راستے کے ذریعے شہر میں داخل ہونے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ اتفاق سے اس وقت سورج نصف النہار پر ہے اور شہر کے اندر داخل ہونے کے لئے ریلوے گیٹ میں سے گزرنا ہے۔ جیپ کا انجن بڑی دیر سے چھک چھک کر رہا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف خوانچہ فروش، حجام اور نہ جانے کون کون براجمان ہیں۔ سڑک کی دونوں طرف بدرو ہے جس میں گرمی کی وجہ سے تعفن کی بھٹیاں ساری فضا کو بوجھل کر رہی ہیں ں۔

جیپ کا ڈرائیور مسلسل ہارن دے رہا ہے۔ ہارن کا گلہ دھیرے دھیرے بیٹھ رہا ہے۔

"ان کو صور اسرافیل ہی آگے سے ہٹا سکتا ہے، ان کی آنکھیں اور کان کھول سکتا ہے"" اگلی نشست پر بیٹھے ساتھی نے کہا۔

مخالف سمت میں ٹرک، تانگے، کاریں، ییلو کیپ اور گڈے ہیں، اسی قسم کی

ٹریفک ہماری سمت میں بھی موجود ہے۔ دونوں طرف ٹیڑھی میڑھی قطاروں میں حرکت ہے لیکن ٹریفک آگے نہیں بڑھ رہی۔ قطاروں میں حرکت سے پیچھے ٹریفک کے دباؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"یار یہ ساری انسانیت نے اسی دروازے سے گزرنا ہے، اتنی زیادہ مخلوق کہاں سے آگئی ہے" میں نے حبس، پسینے اور کاٹنے والی گرمی سے مجبور ہو کر کہا ہے۔ ڈرائیور نے پھر ہارن دے رہا ہے۔ ہارن کا گلہ بیٹھ گیا ہے۔

"بس کرو، بیٹری ختم ہو چکی ہے" اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے ساتھی نے کہا۔ میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے ساتھی نے مشتعل ہو کر جیپ سے باہر چھلانگ لگا کر آگے کھڑے تانگے کے کوچوان کو ڈانٹا ہے، تانگہ سواریوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا زمین بوس ہے۔ گھوڑا نا ختم ہونے والا پیشاب کر رہا ہے اور تانگے کا کوچوان لب سڑک بیٹھے ہوئے حجام سے شیو کرا رہا ہے۔

"یا اللہ یہ شہر کیسا ہے؟" میرے پہلو میں میرے ساتھی نے بیٹھے ہوئے کہا۔

"اتنی زیادہ مخلوق کہاں سے نکل رہی تھی۔"

تنگ آکر ڈرائیور نے پیچھے قطار میں کھڑی گاڑیوں اور ریڑھیوں۔ والوں کی منت سماجت کر کے جیپ کو بیک کر کے واپسی کے لئے راستہ بنایا ہے۔ دوسرے دروازے کے پاس جانے کی نوبت نہیں پہنچی۔ ایک لمبی قطار ہے جس کے سب سے آخر میں جیپ انتظار میں پٹرول ضائع کر رہی ہے۔ ہم تینوں بے حد مضطرب ہیں۔ چار بجنے والے ہیں، ہم بے سود بار بار گھڑیاں دیکھ رہے ہیں لیکن وقت سست رفتار ہے۔ اس مرتبہ اگلی نشست پر بیٹھا ہوا ساتھی چھلانگ لگا کر جیپ سے باہر نکلا کہ ٹریفک کا جائزہ لے کہ کس طرف ٹریفک کا دباؤ زیادہ ہے۔ اس مرتبہ بھی جیپ کے آگے ایک تانگہ سواریوں سے جھکا ہوا ہے۔ کوچوان غائب ہے۔ میرے ساتھی نے جیپ سے گردن نکال کر غور سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ

ایک دم چیخا "او مائی گاڈ' یہ تو وہی کوچوان ہے جو تین میل پیچھے ریلوے گیٹ کے پاس شیو کروا رہا تھا' کیسے یہاں آگیا' اس کی شیو ابھی تک ختم نہیں ہوئی"۔

"میاں عینک کے شیشے صاف کرو' پسینے سے دھندلا گئے ہیں۔"

"یا اللہ یہ لوگ کہاں سے نکلتے آ رہے ہیں' تھمنے کا نام نہیں لیتے' میں نے مایوسی کے لہجے میں کہا۔

"یہ سروے ممکن نہیں' ہم اس شہر کے اندر کب داخل ہوں گے' ہم نے واپس بھی جانا ہے' دن ڈھلنے والا ہے۔"

"جناب بس ایک ہی دروازہ رہ گیا ہے' وہاں سے اندر جانے کی کوشش کرتے ہیں"۔ ڈرائیور نے تھکن سے آدھ موئی آواز میں کہا۔

تین میل کے بعد تیسرا دروازہ بھی آگیا۔ یہاں بھی ریلوے پھاٹک کو عبور کرنا ہے۔ ہم تینوں بہت خوش ہیں کہ دور دور تک کوئی تانگہ' ٹرک وغیرہ نہیں ہیں۔ دور سے لوگوں کا پیدل ہجوم دکھائی دیا ہے۔ ہم نے خوشی میں ڈرائیور کو تیز چلنے کو کہا۔ ڈرائیور نے اندھا دھند جیپ چلاتے ہوئے ایک دم بریک لگائی اور ایک جھٹکے سے جیپ رک گئی ہے۔ ریلوے پھاٹک سے باہر پولیس نے رکاوٹیں لگائی ہوئی ہیں۔ سارجنٹ نے ہاتھ کے اشارے سے روکا ہے۔ سارجنٹ کے پیچھے پھاٹک کے اس طرف اتنا ہجوم ہے کہ پیدل چلنا بھی محال ہے۔ ہم جیپ سے نیچے اتر کر پیدل پھاٹک میں داخل ہونے لگے ہیں لیکن سارجنٹ نے پھر ہاتھ کے اشارے سے اندر جانے سے منع کیا ہے۔

"کیوں؟" ہم تینوں نے پوچھا۔

"اندر ہجوم ہے" اس نے جواب دیا

"یہ اتنے زیادہ آدم زاد کہاں سے آئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں خود نہیں پتہ' بڑے اودھمی قسم کے لوگ ہیں" اس نے جواب دیا۔

"کیا یہ سارے لوگ اسی شہر کے رہنے والے ہیں یا دوسرے شہروں سے آئے ہوئے لوگ ان میں شامل ہو گئے ہیں یا پھر یہ لوگ زمین کے اندر سے نکل رہے ہیں" میرے ایک ساتھی نے غصے سے سارجنٹ کو مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ انسان ہیں اور ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں پتہ کیونکہ ہم ڈیوٹی پر ہیں اور ہمارا کام باہر سے اندر داخل ہوتے لوگوں کو روکنا ہے۔"

"یہ سارجنٹ کم عقل ہے اسے علم نہیں کہ یہ سکھوں کا شہر ہے اور رنجیت سنگھ کے زمانے میں جب جنرل ایوٹابل نے لوگوں پر بہت ظلم کیا تو لوگ زیر زمین چھپ گئے تھے اور اب غالباً وہ مین ہول کے ڈھکنے اٹھا کر باہر نکل رہے ہیں۔"
اگلی نشست پر بیٹھے ساتھی نے کہا ہے اور ہم سب اس کی بے تکی بات پر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے ہیں۔

اس ناقابل حل صورتحال کو دیکھ کر ہم نے واپس جانے کا فیصلہ کیا ہے جس پر ہمارا ڈرائیور بے حد خوش ہے جیسے شہر میں ہمارے داخلے سے بہت سی مشکلات نازل ہونی تھیں۔ اپنی اس ناکامی پر ہم تینوں سہمے ہوئے ہیں۔ ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں ہے' ہم نے چار گھنٹے مسلسل جدوجہد کی تھی لیکن ہمیں شہر کے اندر جانے کی اجازت نہیں ملی۔ ہمارا افسر یقیناً ہم تینوں کو معطل کردے گا اور ہماری اپیل بھی کسی نہیں سنی۔

جیپ تیزی سے وہاں جا رہی ہے جہاں سے ہم نے نامکمل سفر شروع کیا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا ہے۔ کچھ دیر کے بعد دریا کا پل نظر آیا جس کے تین دروازے ہیں' شہر میں تمام ٹریفک ان تین دروازوں سے داخل ہوتی ہے۔ ہم سب ایک حد تک مطمئن ہیں کہ اپنا شہر ہی ہے' یہاں اچھی خاصی واقفیت ہے اندر داخل ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ لیکن دروازوں کے قریب پہنچ کر دیکھا کہ وہی معاملہ ہے' اس کثرت سے ٹریفک شہر کے اندر سے باہر نکل رہی ہے

دوشی

موضع ڈنگہ ضلع گجرات کے کرم دین کو اس کی کمپنی نے اس خصوصی مشن پر بھیجا تھا کہ وہ اپنا تجربہ اور تمامتر ذہانت استعمال کر کے بیماری کی تشخیص کرے اور پھر اس کا علاج کا بھی کوئی بندوبست کرے۔ بظاہر یہ چیلنج کرم دین کی بساطت سے زیادہ تھا لیکن وہ محنتی کسان کا بیٹا تھا جو اس عزم سے بڑے شہر میں آیا تھا کہ اپنے باپ اکرم علی کی دو بیگھ زمین کو رہن سے چھڑا لے گا جو گذشتہ تیس سالوں سے ایک آڑھتی کے پاس تھی۔ اتفاق سے اکرم علی کے کھیتوں کے قریب کسی بین الاقوامی ایجنسی نے پسماندہ ممالک کی مدد کے کسی پراجیکٹ کے تحت پختہ سڑک تعمیر کرنے کا اعلان کیا جس کی وجہ سے کچی سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے کھیتوں کی قیمت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ گاؤں کے آڑھتی شاہ کو بھی اس کا احساس تھا۔ اکرم علی جب بھی کرم دین کی تنخواہ کا کچھ حصہ بطور قسط شاہ آڑھتی کے پاس لے کر جاتا وہ باتوں باتوں میں اسے زمین فروخت کرنے کی ترغیب دیتا۔ اکرم علی نے یہ بات کرم دین کو بتائی تھی۔ کرم دین تھا تو نوجوان لیکن اس میں ایک دیہاتی کی شاطری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس نے تحصیل ہیڈ کوارٹر کے ایک انٹر کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا تھا۔ لیکن کہیں نوکری نہیں ملی تھی۔ چھ مہینے سال بیکار رہنے کے بعد اکرم علی اسے بڑے شہر ملازت کے لئے بھیجنا چاہا تھا۔

نہیں تھی۔ اکرم علی ایک دیہاتی تھا' وہ بڑے شہر میں دولت کمانے آیا تھا اور
اسے دو روپے میں دن گزرانے کا طریقہ بھی آتا تھا۔ لیکن طرح طرح کے
منصوبے اس کے دماغ کی ہنڈیا میں ابلتے رہتے۔ ایک دن اس نے ایک کمپیوٹر
کالج میں شام کی جماعتوں میں داخلہ لے لیا۔ اس کام میں اس کا دماغ اتنا چلا کہ
سب کو حیرت ہوئی۔ وہ کمپیوٹر سائنس پر طرح طرح کی کتابیں پڑھنے لگا۔ کمپیوٹر
کالج کا مالک بٹ شاطر آدمی تھا۔ اس نے ایک فیشن ایبل علاقے میں کمپیوٹروں
کی ورکشاپ بھی کھولی تھی۔ بٹ نے اپنی ورکشاپ میں اکرم علی کو جزوی وقتی
ملازمت دے دی۔ اکرم علی چند منٹوں میں کمپیوٹر درست کر لیتا۔ چند ہفتوں کے
بعد بٹ نے اس کے تنخواہ دگنی کر دی' کیونکہ اکرم علی رات گئے تک ورکشاپ
میں اکیلا کام کرتا رہتا۔ وہ صبح نیند میں لڑکھڑاتا ہوا دفتر جاتا اور دفتر کے
سپرنٹنڈنٹ سے دیر آنے پر جھڑکیاں سنتا۔ بٹ کے کہنے پر اس نے ملازمت سے
استعفٰی دے دیا۔ اور ہمہ وقت وہ ورکشاپ میں کام کرتا۔۔۔ اکرم علی جس
یقین سے اپنی کٹ لے کر ورکشاپ سے ایک بینک کے بلانے پر گیا تھا جیسے معمول
کے مطابق وہ چند لمحوں میں کمپیوٹر کے کل پرزے درست کر لے گا۔ لیکن اس
کے برعکس دوپہر کے بارہ بجنے کو آئے تھے اور ابھی تک بینک کا مین فریم کمپیوٹر
بے حس و حرکت تھا۔ اتفاق سے بینک کا ایئر کنڈیشنر بجلی کے فوری صدموں سے
رک گیا تھا' حبس اور گرمی سے بچنے کے لئے وہ کمپیوٹر روم سے باہر بینک کے ہال
میں آیا تھا جہاں بے شمار لوگ حبس سے پسینے میں شرابور' بڑبڑاتے ہوئے ہاتھوں
میں ٹوکن لئے بے چینی سے ٹہل رہے تھے' ادائیگی کا کاونٹر بند تھا کیونکہ کمپیوٹر
جام ہو چکا تھا اور خزانچی باری باری سب کو تسلی دے رہا تھا کہ بس چند لمحوں کے
بعد کمپیوٹر ٹھیک ہو جائے گا۔ اور پھر سب کے حساب کتاب ٹھیک ہو جائیں گے۔
"یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں چل سکتا' سب کچھ فیل' پنسل سے حساب کتاب اس

مشین سے بہتر ہے۔"۔ ۔ بینک مینجر بیسویں مرتبہ اکرم علی کا کندھا ٹھونک کر نتیجے کا منتظر تھا۔

"مسٹر کیسے میکینک ہو' تین گھنٹوں سے لگے ہو' بینک کا نظام معطل ہو چکا ہے' روپے کی سرکولیشن رک گئی ہے۔" ۔ ۔ "تو پھر لوگ بھوکے پیاسے کیوں نہیں مرتے" اکرم علی یہ بے تکی سی بات کہہ کر کمپیوٹر کے پرزوں کا معائنہ کرنے لگا' اس نے کمپیوٹر کے کارڈ دیکھے' اور پھر اس نے اپنے تھیلے میں سے اینٹی وائرس ڈسک چلانے کی کوشش کی۔ ایک دم اینٹی وائرس پروگرام چلنے لگا' اس نے جلدی سے کمپیوٹر کی ڈرائیویں چیک کیں۔ ایک دم اس کی سکرین پر لکھا ہوا آیا Wellcome to Joshee Virus - get my vaccine بینک کے مینجر نے اکرم علی کو دیکھا۔۔ "جناب آپ کے ساتھ بہت بڑا ہاتھ ہو گیا ہے' آپ کا سارا نظام بیکار ہو چکا ہے؟" مینجر نے گھبراہٹ سے کہا۔

"کیا سب کچھ جام ہو گیا ہے؟

اکرم علی مسکرایا۔

"جناب وائرس کی وجہ سے"۔۔۔ "مسٹر میکینک' یہ کسی سازش کا نتیجہ ہے' ہو سکتا ہے اس میں کسی دوسری طاقت کا ہاتھ ہو؟' جلدی کچھ کرو' دیکھو لوگ بینک کے ملازموں سے دھول دھپا کرنے لگے ہیں۔"

اکرم علی نے اپنے اوزاروں کی کٹ کا تھیلا بند کیا۔

"سر یہ نسخہ بہت مہنگا ہے' آپ کے بینک کا سارا نظام رک چکا ہے' بٹ صاحب کے پاس اس کا نسخہ ہے۔"

"تم خرچے کی بات چھوڑو' میری کار لے جاؤ اور ویکسین لے آؤ۔"

اکرم علی بہت خوش تھا کہ بٹ نے اس کی کارکردگی کی وجہ سے دو سو روپے انعام دیئے تھے۔ لیکن دو دنوں میں ہی اس کی خوشی ختم ہو گئی تھی۔ اس کے باپ

کا خط اسے ابھی ابھی موصول ہوا تھا جس میں اس نے دس ہزار روپے کا تقاضا کیا تھا کیونکہ زمین کے رہن چھڑانے کی تاریخ ختم ہونے والی تھی۔ خطرہ یہ تھا کہ جس کے پاس زمین رہن رکھی گئی تھی وہ بڑا شاطر آدمی تھا۔ وہ اونے پونے زمین حاصل کر کے اس مہنگے داموں میں فروخت کرے گا۔ اور اس طرح وہ مستقبل کے ایک بہت بڑے خزانے سے محروم ہو جائے گا۔ دوسری طرف اسے گاؤں میں اپنی بے عزتی کا بھی خطرہ تھا کہ بغیر زمین کے اس کا باپ پھر مزارعہ بن جائے گا۔ اور گاؤں کے لوگ بھی کہیں گے کہ وہ نوکری پر تھا اور باپ کی زمین دوسرے نے غصب کر لی۔

اکرم علی نے اپنے ساتھی ارشد سے بات کی کہ یہ مسئلہ کس طرح طے کیا جائے۔ ارشد اس کے گاؤں کا رہنے والا تھا اور وہاں کی سیاست سے آشنا تھا۔

"سنو اکرم' شاہ بہت کھچرا ہے۔ تمہاری زمین کے بالکل سامنے پکی سڑک بن رہی ہے۔ یہ لاکھوں کی ہو جائے گی' شاہ اسے نہیں چھوڑے گا"

"میں نے بٹ سے بات کی ہے وہ اتنا زیادہ ایڈوانس دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جوشی کا بھائی دوشی بناؤ جس سے سارے ملک کے کمپیوٹر جام کئے جا سکیں پھر ان کو چالو کرنے کے لئے ویکسین بناؤ اور دس ہزار روپے لے لو۔

"کیا بکواس ہے؟" ارشد نے حیران ہو کر پوچھا۔

" بھئی جوشی ایک وائرس ہے جو کمپیوٹر کے نظام کو منجمد کرتا ہے' بیمار کر دیتا ہے' پھر اسی کمپیوٹر کو صحت مند کرنے کے لئے اسے ویکسین کا ٹیکا لگایا جاتا ہے۔ بٹ یہ کہتا ہے کہ جوشی تو بن چکا ہے اب دوشی بناؤ جو سارے نظام کو ختم کر دے۔"

شام کا وقت تھا۔ گرمی کافی تھی۔ ارشد نے چھوٹے سے صحن میں انگیٹھی رکھی ہوئی تھی اور روٹیاں پکا رہا تھا۔ وہ توے پر روٹی ڈال کر قدرے

حیرت سے اکرم علی کو دیکھنے لگا کیونکہ وہ خود ایک کلرک تھا اور اسے کمپیوٹر کے بارے میں کچھ بھی نہیں پتہ تھا۔

"ارشد تم بالکل پینڈو ہو۔ میری بات نہیں سمجھے' میں دوشی کی ایک ڈسک بنا رہا ہوں' بٹ کے میکانک جہاں بھی کمپیوٹر ٹھیک کرنے جائیں گے' پہلے اس میں دوشی کی ڈسک ڈال کر اسے اور زیادہ بیمار کر دیں گے۔ اس کا نظام ناکارہ کر دیں اسے صحت مند بنانے کے لئے انہیں اپنی دوشی ڈسک درکار ہو گی۔ سمجھے گدھے۔" ارشد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔۔

"اس کا مطلب ہے پہلے تم خود ہی بیمار کرو اور پھر اس کا علاج۔۔"

"ہاں' بس یہی سمجھ لو' میں نے بٹ سے اس کام کا ایڈوانس مانگا ہے' وہ ففٹی پرسنٹ سے زیادہ دینے کو تیار نہیں ہے' دیکھیں گے۔"

رات کا کھانا دونوں نے صحن میں بیٹھ کر کھایا اور سگرٹ پینے لگے۔

"اب کہاں کا ارادہ ہے؟" ارشد نے پوچھا۔

"ورکشاپ کی چابی میرے پاس ہے' مجھے ابھی کچھ کام کرنا ہے۔"

"واپسی کتنے بجے ہے؟"

"کچھ پتہ نہیں' شاید صبح کے وقت' میں دیوار پھلانگ کر اندر آجاؤں گا' تم مزے سے سوتے رہنا۔"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے اور پھر ایک دم ارشد بولا۔

"یار میں اب سمجھا ہوں۔ جو تم کرنا چاہتے ہو وہ جرم ہے' تم تو نمازی پرہیزگار ہو۔۔۔۔۔"

"یار اللہ کا کام اللہ کے ساتھ لیکن مجھے اپنے باپ کی زمین بچانی ہے' مجھے کیا فرق پڑتا ہے کہ نظام چلتا ہے یا فیل ہوتا ہے' میرے ساتھ کسی نے رعایت نہیں کی' میں تو ایک وائرس بنانا چاہتا ہوں' شہر میں تو ہر جگہ ایسے وائرس تو پہلے ہی

پھیلے ہوئے ہیں اور جن کا علاج نہیں ہے۔"

صبح کے تین بجنے کو آئے تھے اور اکرم علی بٹ کی ورکشاپ میں اپنے کمپیوٹر کے آگے بیٹھا جوشی وائرس کا سکرین پر مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے بڑی تگ و دو کے بعد اس کے اجزائے ترکیبی ڈھونڈ لئے تھے۔ دوشی وائرس بنانے کے لئے جوشی میں چند تغیرات کرنے تھے۔ اس کا سر شدید درد سے چکرا رہا تھا' اور وہ اپنا بائیں ہاتھ مسلسل میز پر مارتے ہوئے دوشی دوشی کا وظیفہ کر رہا تھا۔

"دوشی۔۔۔ کیڑا۔۔۔۔ وائرس۔۔۔۔ یہ سارے نظام کو منجمد کر دے گا ۔۔۔۔ دوشی وائرس سے لوگوں کی جمع تفریق بند ہو جائے گی" اس نے سگرٹ سلگایا اور اس کے دوران سر میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ سکرین پر مختلف گراف اور سگنلز میں سے ایک بہت سے پیروں والا گراف لائینوں اور کمپیوٹر کی زبان کے اشاروں کو توڑتا ہوا لمحہ لمحہ کیکڑے کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ اکرم کو کچھ حیرت ہوئی' اس نے ایک دو مرتبہ اپنا سر اس خیال سے جھٹکا کہ نیند کے غلبے سے اس کی نظر میں دھندلاہٹ آگئی تھی۔ لیکن سر جھٹکنے سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس نے کمپیوٹر کی کلیدوں پر انگلیاں ماریں مگر بے سود۔

"او مائی ڈیئر دوشی' اس میں مرا دوش نہیں کہ میں تمہیں بنا رہا ہوں یا کوئی ضرورت تمہیں بنا رہی ہے' لیکن تمہارا وجود میرے لئے اور بٹ دونوں کے لئے ضروری ہے۔ تم وائرس نہیں ہو وہ تو سگنلز ہوتے ہیں۔" اکرم نے سگرٹ سلگایا اور ورکشاپ میں ادھر ادھر دیکھا' اس کے لیمپ کی مدہم روشنی جل رہی تھی ورکشاپ کی درزوں میں آتی تازہ ہوا اسے صبح کا یقین دلا رہی تھی۔ اس نے غور سے ورکشاپ میں رکھے کمپیوٹروں کو دیکھا' سب کے سکرین روشن تھے اور سب کی سکرینوں پر وہی کیکڑا بن رہا تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر اپنی جگہ سے اٹھا اور کمپیوٹروں کے سوئچ دیکھنے لگا جو سب بند تھے۔ اس نے سب کی سکرینوں پر ہاتھ

پھیرا جیسے وہ انہیں مٹانا چاہتا تھا۔ لیکن سب کچھ اسی طرح تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور خوف دھیرے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر رہا تھا۔ گھبراہٹ میں اس نے باہر گشت کرتے ہوئے چوکیدار کو آواز دینا چاہی مگر آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ اس نے ورکشاپ سے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن اس کے قدموں نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ خوف' گھبراہٹ اور بے بسی میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر دوشی بنانے میں مصروف ہو گیا۔"

"اچھا دوست تم نے ایک دو دنوں میں شہر میں سرمائے کو' لوگوں کے حساب کتاب کو منجمد کرنا ہے' تمہاری قوت سے میں آشنا ہوں' تمہارے سر کی قیمت بٹ نے دس ہزار روپے رکھی ہے اور میرے باپ کو تین دنوں میں یہ رقم چاہیے ہے۔ بھاڑ میں جائے اگر سب غارت ہوتے ہیں۔ اگر میں تمہیں نہ بناؤں تو پھر میں ہلاک ہو جاؤں گا' اچھائی برائی تو کھاتے پیتے لوگوں کا مسئلہ ہے"۔ اکرم کا ذہن قدرت نے چھوٹی چھوٹ باتوں کے لئے بنایا تھا۔ اس نے ایک دم کمپیوٹر کی سکرین کی طرف دیکھا۔ بیشمار ٹانگوں والا وائرس ایک اونٹ کی طرح آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا۔ اس نے ایک اور سگرٹ سلگایا اور پروگرامنگ کی کتابوں کے ورق الٹ پلٹ کرنے لگا۔ کافی تگ و دو کے بعد اس نے دوشی وائرس بنا لیا اور سکرین پر جلدی سے لکھا Welcome to Doshi۔ اس کے بازو شل ہو چکے تھے اور سر میں شدید درد تھا۔ یہ اس کی مہم کا پہلا حصہ تھا۔ دوسرا حصہ اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لئے ویکسین بنانا تھا جو نہیں بن رہی تھی۔ کرم دین کی انگلیاں چلتی چلتی رک گئیں' پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ کام کرنے سے انکار کر رہی تھیں۔ اسے کچھ تشویش ہوئی۔ اس کے بعد اس کے سارے جسم میں بے تحاشا خارش ہونے لگی۔ اس نے کرسی سے اٹھنا چاہا لیکن ریڑھ کی ہڈی نے اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے بدن پر نگاہ

ڈالی جو سکڑ رہا تھا تو اس نے کمپیوٹر کی سکرین کی طرف دیکھا۔ وائرس اونٹ کی صورت میں کھڑا ہو چکا تھا۔ اکرم نے بھی اسی اونٹ کی طرح اپنی سیٹ سے اٹھنا شروع کیا۔

"نہیں' نہیں" وہ زور سے چیخا اور ورکشاپ کے چوکیدار کو آواز دی

"جلدی آؤ' سارے شہر کو خطرہ ہے' وہ کمپیوٹر سے باہر نکلنے والا ہے۔"

ورکشاپ کا آہنی دروازہ کھلا اور پٹھان چوکیدار اندر داخل ہوا۔

سایہ

میری ساری زندگی عمارتوں کے کمروں اور تہہ خانوں کے دھندلکوں اور مصنوعی روشنی میں کام کرتے ہوئے گزر گئی ہے۔ میں نے سورج کو مشرق سے نصف النہار پر آتے اور نہ ہی اسے مغرب کی طرف جھکتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں قریباً تیس برسوں سے اسی ماحول میں کام کر رہا ہوں۔ جب سورج افق پر سرنگوں ہوتا ہے تو میں اپنے گھر چلا جاتا ہوں۔ مجھے ہمیشہ سے یہی احساس رہا ہے کہ باہر سڑکوں پر نہ جانے کیا موج میلہ ہو رہا ہے میں جس میں شرکت سے محروم ہوں۔ مجھے بھی باہر نکل کر سورج کے سفر کو اور اس کی روشنی میں گھومتے پھرتے لوگوں کو دیکھنا چاہیے۔ ایک دن میں نے فیصلہ کیا کہ میں بھی ساری دفتری پابندیاں توڑ کر باہر نکل جاؤں گا' ہجوم میں گھل جاؤں گا۔ کسی فیشن ایبل ہوٹل کی لابی میں آرام کرسی پر بیٹھ کر کریم کافی پیوں گا اور بدہیبت پینڈو قسم کے موٹے موٹے سیٹھوں کے ساتھ اندر آتی ہوئی عورتوں کے بدن کے خطوط کا نظارہ کروں گا۔ میں نے دوسری منزل پر اپنے دفتر کی سربند کھڑکی بڑی مشکل سے کھولی۔ اس کے کھلتے ہی زبردست شور کا ایک ریلا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ انسانی آوازیں' رکشاؤں اور کاروں کا شور دہلانے والا ہے۔ ایک سمت سے لوگوں کا ہجوم نعرے مارتا ہوا آ رہا ہے۔ پولیس ان پر آنسو گیس پھینک رہی ہے: حکومت بدلو' آٹا دال زندہ باد---" میری آنکھیں پہلے جلنے لگی ہیں پھر آنسو بہنے لگے ہیں۔ میں نے کھڑکی کا در بند کر دیا ہے اور کرسی پر بیٹھ گیا ہوں۔ پچھلے پچاس برسوں سے یہی ہو رہا ہے۔ مجھے اس کی عادت ہے۔ کھڑکی کی درزوں میں سے

بھی آنسو گیس کی بو آ رہی ہے۔ میرے کہنے پر نائب قاصد نے درزوں کے اوپر دو تین تولیے دبا کر پھیلا دیے ہیں۔

میری طبیعت کچھ بجھ گئی ہے۔ میں دفتر کی جس کرسی پر بیٹھا ہوں وہ گھومنے والی ہے۔ یہ میری ٹانگوں کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ دھرتی کی طرح گھومنے لگی ہے۔ میں کرسی پر نہیں دھرتی کی چوٹی پر بیٹھا گھوم رہا ہوں' یہ گردش تیز ہوتی جا رہی ہے' اردگرد کی چیزیں بھی تیزی سے گھوم رہی ہیں' ان چیزوں میں سے شرارے نکل رہے ہیں اور وہ اپنی اصل ہیئتیں کھو کر گھومتے ہوئے کرے بن گئے ہیں جو میرے گرد گردش کر رہے ہیں یا میں ان کے گرد گردش کر رہا ہوں۔ میرے حواس سمٹ کر دماغ کے عین مرکز میں جمع ہو گئے ہیں' اردگرد کی شناخت کا قرینہ محو ہو رہا ہے۔ زور زور سے گھنٹیاں بج رہی ہیں' ان کے اصرار سے میں ہڑبڑا کر اٹھا ہوں' کرسی کی یا زمین کی گردش گرتے ہوئے لٹو کی طرح کم ہو رہی ہے۔ میں نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی ہے۔ میری میز پر رکھے چاروں ٹیلیفون بیک وقت بج رہے ہیں اور نائب قاصد تھوڑا سا دروازہ کھول کر حیرت سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں مجھ سے چار ہوتے ہی وہ پیچھے ہٹ گیا ہے۔ ذہن کی گردش سے جو خیالات میرے گڈمڈ ہو رہے تھے وہ بتدریج اپنے نہاں خانوں میں دھیرے دھیرے واپس جا رہے ہیں۔

میں آپ کو اپنی حقیقت بتانا چاہتا ہوں' اپنی ماہیت بیان نہیں کر سکتا کیونکہ اتنی عمر گزرنے کے باوجود میں ابھی تک اپنی دریافت میں لگا ہوا ہوں' اپنے آپ کو بیحد کھنگالا ہے، لیکن اندر سے کچھ نہیں نکلا۔ میں اپنی حقیقت کی بجائے اپنی موجودہ حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔ میرے فلسفی دوست کا خیال ہے کہ حقیقت کس طرح بنتی ہے اور اس کے اجزا کیا ہیں' یہ اونٹالوجی کا مسئلہ ہے' چونکہ میں دفتری قسم کا آدمی ہوں مجھے ایسی سرگرمیوں سے باز رہنا چاہیے لیکن مشکل یہ ہے کہ

ذہن پیہم حرکت میں رہتا ہے۔۔۔ دراصل میں جس دفتر کا سربراہ ہوں اس میں
کام بہت کم ہے۔ چند ایک فائلیں نکالنے کے بعد میرا سارا دن ایک غبارے کی
طرح خالی ہوتا ہے۔ میں اس میں ہوا بھرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پچھلے چند دنوں
سے میرا ایک دوست امریکہ سے آیا ہے اور وہاں سے لائے ہوئے نظریات کا پر
چار کرتا رہتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ امریکہ میں لوگ یوگا کے ذریعے شانتی
اور شکتی حاصل کرتے ہیں۔ میں نے اس کی بات مان لی اور دفتر کا دروازہ بند
کرکے میں یوگا کرنے لگا' مجھے اس کی ورزشیں کچھ احمقانہ سی لگیں۔ میں نے
اسے ترک کرکے نمازیں پڑھنی شروع کیں' ان سے قدرے طبیعت میں عارضی
سا سکون پیدا ہوا۔ چند دنوں کے بعد میرے کان میں بھنک پڑی کہ دفتر میں چہ
میگوئیاں ہونے لگی ہیں۔۔ دفتر میں دکھاوے کی نماز کا مطلب ہاتھی کے دانت
والا مسئلہ تو نہیں ہے۔ مجھے یہ بات نہ بھائی۔ میں نے ان لوگوں کے خلاف محکمانہ
کاروائی کرنے کا فیصلہ کیا کہ وہ میری اور مذہب کی توہین کر رہے ہیں۔ میں نے
اپنے ایک دو اعتمادی اہلکاروں سے ایسے ملازمین کی فہرست بنانے کو کہا۔ فہرست
بن گئی جب میں نے اس فہرست کی تصدیق کروائی تو پتہ چلا کہ فہرست بنانے
والے نے اپنے مخالفوں کے نام اس میں درج کر دیئے تھے۔ اصل میں CBA کے
ممبر میرے درپے ہیں جو مجھ سے جھوٹا بونس چاہتے ہیں اور میرے انکار پر انہوں
نے میرے بارے میں ایسی باتیں پھیلانی شروع کی ہیں۔ کیا کرتا خاموش رہا
کیونکہ CBA بہت مضبوط ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ فراغت میرا اصل
مسئلہ ہے۔ مجھے یہی خدشہ رہا ہے کہ اس فراغت میں میرا ذہن کہیں شیطان کی
کارگاہ نہ بن جائے۔ میری طبیعت میں انتہاپسندی ہے۔ اگر شیطان مجھ پر حاوی
ہوگیا تو میں بدی کا بادشاہ بن جاؤں گا' پھر مجھے روکنا مشکل ہو جائے گا۔ بدی کے
راستے کی پہلی سیڑھی عورت ہے' اس کی دوسری سیڑھی ارغوانی ہے اور

سری سیڑھی جوا ہے جس کے ذریعے پہلی دو بدیوں کا راستہ ہموار کیا جا سکتا
ہے۔۔۔۔۔ بس بس' میں نے اپنے ذہن سے کہا بدی کا راستہ اختیار کرنے کے
لئے بھی پیسے کی ضرورت ہے۔ اور ادھر میری تنخواہ برسوں سے ایک سکیل پر
رکی ہوئی ہے۔ اس سے میرے خانگی اخراجات بمشکل پورے ہوتے ہیں۔ میں
اپنی خانگی زندگی کو اسی طرح چلنے دیتا ہوں جس طرح وہ چل رہی ہے۔ میری
دوسری زندگی بالکل شخصی ہے اس کے بارے میں میرے سوا کسی کو علم نہیں ہے
کہ میری سنجیدہ شخصیت کی کھال کے نیچے کس قسم کا لاوا چھپا ہوا ہے۔ یہ میرے
خیالوں کی زندگی ہے جسے میں اپنی دوسری زندگی سے خلط ملط نہیں ہونے دیتا۔
میں کافی عرصہ تک نیکی کے راستے پر چلا ہوں جو بے ثمر ثابت ہوئی ہے۔ میں
اکیسویں صدی میں داخل ہونے والا مضطرب شخص ہوں جو اپنی نیکی کا اجر اس دنیا
میں چاہتا ہے۔ اوہ! نیکی نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

میں گیارہ بجے ایکپریسو کافی پیتا ہوں لیکن جب سے اس دفتر میں آیا ہوں
نہایت ردی قسم کی کافی ملتی ہے۔ کافی پینے کے بعد میں اپنے کمرے سے باہر نکلتا
ہوں جس کے سامنے ایک اور دروازہ ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی گیلری ہے اور میرا
ذاتی عملہ وہاں پر بیٹھتا ہے۔ اس گیلری سے باہر ایک لمبی سی کاریڈور ہے جس کے
دونوں طرف دفتر کے کمرے ہیں۔ جب سے میں اس دفتر میں آیا ہوں مجھے گھٹن
کا احساس ہوتا ہے۔ کہیں سے ہوا نہیں آتی۔ اس کاریڈور میں بھی اسی طرح کی
گھٹن ہے۔ کاریڈور میں روشنی کم اور تاریکی زیادہ ہے۔ یہ سرنگ نما کاریڈور
چلتی جاتی ہے' راستے میں لفٹوں کی طرف جانے کا راستہ ہے۔ جونہی کاریڈور کا
دروازہ کھولو تیز ہوا کے جھونکے بدن سے ٹکراتے ہیں۔ جب میں اس مقام سے
سرنگ کی طرف دیکھتا ہوں تو اس میں چلتے ہوئے اہلکار سائے لگتے ہیں۔ شاید میں
بھی انہیں دور سے سایہ لگتا ہوں' مجھے دیکھتے ہی ان کے سائے معدوم ہو جاتے

ہیں۔ جب میرا سایہ معدوم ہو جاتا ہے تو ان کے سائے نمودار ہوتے ہیں۔ یہ بلی اور چوہے کا کھیل ہے۔ میں بلی ہوں اور وہ چوہے ہیں۔ انہیں علم نہیں کہ میں بھی ان کے لئے ایک چوہا ہوں جو سارا دن لمبی لمبی کاروں اور پجاروں جیپوں میں سڑکوں کا سینہ کوٹتے رہتے ہیں۔ میں بلی نہیں بننا چاہتا لیکن مجھے بنا دیا گیا ہے۔ یہ ایک بھیس ہے جس کے پیچھے میں اور پورا ایک نظام چھپا ہوا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے' اس لئے ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں۔ اگر میں اصلی بھیس سے باہر آؤں تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ کچھ بھی نہ ہو کر کس طرح زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ میرے ایک پروفیسر دوست نے مجھے سمجھایا کہ کچھ نہ ہونا میری اونتالوجی ہے۔ چھوڑو یار ہم کس بک بک میں لگ گئے ہیں' زندہ رہنے کے لئے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے' اسے مویشیوں کی طرح بسر کرنا چاہئے۔

میری آنکھوں سے ایک فٹ کے فاصلہ پر ایک میل خوردہ کانسی کا بورڈ آویزاں ہے جس پر ایک ادارے کا نام درج ہے' مجھے یہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں اس ادارے کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔۔ بہت سال پہلے میں یہاں کبھی کبھار کوئی کتاب پڑھنے یا کسی ادبی یا ثقافتی جلسے میں شرکت کے لئے آیا کرتا تھا۔ یہاں دیواروں کے ساتھ کتابوں کی الماریاں ثبت تھیں۔ لوگ آتے جاتے کافی رونق رہتی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس ادارے کو غیر ضروری سمجھ کر بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک دور آیا جب اسے ثقافتی زندگی کے احیا کے لئے ضروری سمجھا گیا اور اس کی رونق دوبالا ہو گئی۔ اس کے بعد ایک اور دور آیا جب اسے ادارے کو غیر ضروری سمجھ کر بند کر دیا گیا۔ پتہ نہیں اب یہ ادارہ ضروری ہے یا غیر ضروری؟ میں یہ سوچتا ہوا ہال کمرے میں چلا آیا ہوں۔ ہال میں تاریکی ہے' کرسیوں پر کرسیاں اوندھی کر کے رکھی گئی ہیں' اخبار اور رسالے ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔ کاونٹر پر ایک دیہاتی ٹانگیں پھیلائے ہوئے سو رہا

ہے۔ میں نے ہال سے ملحقہ دفتر میں جھانکا ہے وہاں ایک ٹائپسٹ ٹائپ رائیٹر پر اخبار پھیلائے مطالعے میں مصروف ہے۔ ایک اور دیہاتی دفتر کے گوشے میں کھڑا چائے بنا رہا ہے۔ دو اہلکار آپس میں فحش مذاق کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ تمام کے تمام دیہاتی ہیں جو بیحد اکھڑ ہیں' میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ اس شہر کے سارے دفتروں میں دیہاتی کیوں بھرتی کئے گئے ہیں اور اس شہر کے لوگ کہاں ملازمت کرتے ہیں۔

"جناب یہ انسان نہیں ہیں' یہ ووٹ ہیں اور ہر ووٹ اپنی قیمت وصول کرتا ہے۔ یہ شہر بڑا ہے یہاں کوئی کسی کو نہیں جانتا" ---- اس ادارے کے دفتر میں ان دیہاتیوں کا یہ منظر دیکھ کر میں زور سے کھانسا ہوں لیکن کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ میں نے بھرپور لہجے میں کہا۔۔ "جناب میں اس لائبیریری کا ممبر بننا چاہتا ہوں"۔ پھر بھی کسی نے جواب نہیں دیا۔ میرا پارہ کافی چڑھ چکا ہے۔ میں نے پھر کہا۔۔۔

"جناب میں ممبر بننا چاہتا ہوں"۔ ٹائپسٹ نے ایک لمحے کے لئے اخبار اپنے منہ سے ہٹا کر کہا ہے-----

"یہ دفتر بند کر دیا گیا ہے"۔

"کیوں؟

"جنہوں نے بند کیا ہے ان سے پوچھیں"۔

"ان کتابوں کا کیا فیصلہ کیا گیا ہے؟"۔

"ردی میں بیچنے کا۔"

"یہ دفتر ہے کہ کباڑ خانہ' تم لوگ نہایت بدتمیز ہو" میں نے غصے سے کہا ہے میں تمہارے خلاف لکھ کر بھیجوں گا' میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں"۔

وہ نائب قاصد جو چائے بنا رہا ہے وہ کھلکھلا کر ہنسا ہے۔۔

زرد دھواں

میں سالہا سال سے اپنی سوانح عمری لکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں لیکن جو کچھ دیکھا ہے اسے تحریر کرنے کی مہلت نہیں ملی، میں نے اپنے سوا سب کو دیکھا ہے، انسان کو اس کی بلندی اور پستی پر اترتے اور چڑھتے ہوئے۔ اپنے آپ کو نہ دیکھنے کی وجہ میری دفتری زندگی تھی جو آخر کار بے اجر ثابت ہوئی ہے اور مجھے زندگی کی دہلیز پر اس طرح چھوڑ گئی ہے جیسے میں نے ابھی تک کچھ نہیں کیا۔ میری ایک مشکل تھی اور اب بھی ہے کہ میں ہر بات کو ایک مقرر وقت پر کرنے کا عادی تھا۔ میں عین آٹھ بجے اپنی سیٹ پر آ جاتا اور ۵۰-۲ بجے اٹھ جاتا۔ میں اوور ٹائم کرنے کا عادی نہیں تھا کیونکہ یہ میرے ذاتی وقت میں مداخلت تھی اور میں اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ اپنی ملازمت کے دوران میں نے چار حکومتیں بدلتی دیکھیں اور میرا قلم ان چاروں کے فرمان بجالاتا۔ ہر ایک کا طریق کار اپنا اپنا تھا لیکن ہر ایک کی خواہش یہ تھی کہ اس کے کارندوں کا کام سب سے پہلے اور ہر طرح کے اصولوں کو نظرانداز کر کے کیا جائے۔ میں جس سطح پر کام کرتا تھا وہاں صحیح اور غلط میں تمیز کی اجازت نہیں تھی، مجھے صرف وہی کام کرنا تھا جس کا مجھے حکم دیا جاتا تھا۔ معاف کیجئے، میں اپنی سوانح عمری لکھنے کی بجائے کن فضول باتوں میں کھو گیا ہوں جن کا میرے ماضی سے تعلق ہے۔ اپنی سوانح عمری کو التوا میں رکھنے سے مجھے ایک فائدہ ہوا کہ مجھے زندگی کو مزید دیکھنے کا موقعہ ملا۔

لیکن جب ان تجربات پر نظرِ ثانی کرتا ہوں تو احساس ہوا ہے کہ انسان کے پاس کہنے کے لئے بہت کم ہے اس لئے اس کے تجربات میں تنوع بھی کم ہے' وہ ہمیشہ "چاہتا" ہے اور اپنے سوا کسی کو کچھ دیتا نہیں ہے۔ گھوم پھر کے وہی چند باتیں ہیں: میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے' میرا حق دیا جائے۔ چلو کچھ بھی ہو میرے پاس لکھنے کے لئے کافی مواد ہے۔ میں دوسروں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے بارے میں بھی کچھ لکھ سکتا ہوں کیونکہ میں بذاتِ خود تو کچھ نہیں ہوں اور دوسروں کے حوالے سے ہی میں جانا جاتا ہوں۔ دوسرے میری وضاحت کرتے ہیں اور میں ان تک پہنچنے کا ایک واسطہ ہوں۔

اب یہ رسی بھی کٹ گئی ہے۔ میں سب دھندوں سے آزاد ہو گیا ہوں اور میرا کام اب صرف دیکھنا ہے کہ دوسرے کیا کرتے ہیں۔ پہلے میں بھی ان میں شامل تھا لیکن گزشتہ ۳۰ دنوں سے میں پینشن پر آ گیا ہوں۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا' میں تو سر جھکا کر فائلوں پر مست تھا اور وقت میرے پاس سے گزر رہا تھا میں نے پلک اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ اگر دیکھ لیتا تو پھر بھی کچھ کرتا اور وقت مجھے اچانک میں نہ لے لیتا۔ چونکہ یہ ایک ایسی صورتحال ہے جس کا کوئی حل نہیں ہے' اسی لئے میں نے اپنی سوانح عمری لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آخر کار اپنے لئے بھی وقت مل گیا ہے۔ میں کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ کچھ لکھوں لیکن مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں "نہیں رہا ہوں"۔ میں ایک مردہ خشک لکڑی ہوں جسے جلایا جا سکتا ہے یا جس سے میز کرسی بنائی جا سکتی ہے۔ ایک دو دن تو میں بہت خوش رہا' اپنی مرضی سے اٹھتا اور جو کچھ من میں آتا وہی کچھ کرتا رہا ہوں۔ لیکن تیسرے دن یہ خوشی ماند پڑ گئی اور میں گزشتہ کے معمول کے مطابق صبح صبح تیار ہو کر ٹہلنے لگا۔ پھر سوچا کہ میں ۳۰ برس جس وقت اور جس

راستے پر چلتا رہا ہوں وہ میرے لئے بند ہو چکا ہے۔

"مجھے بینک جانا ہے' پھر پینشن کا مسئلہ طے کرنا ہے" میں یہ سوچ کر دفتر چلا گیا جہاں میرے ساتھی اور ماتحت سر کی جنبش سے میرے سلام کا جواب دے کر تیز تیز چلتے ہوئے کوریڈورز میں سے گزر گئے ہیں۔ میں اپنے کمرے میں بھی گیا جہاں کوئی اجنبی میری نشست پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ یہ وہ نشست تھی جہاں سر کھجلانے کی مہلت بھی نہیں ملتی تھی"۔ میں کچھ برا محسوس کر کے یہ سوچتا ہوا اپنے فلیٹ میں آ گیا کہ زندگی ہر شخص کے بغیر بھی ممکن ہے۔ راستے میں یونیورسٹی بھی آئی اور ڈاکٹر وولنر کا بت جسے ابھی تک مسمار نہیں کیا گیا۔ میں بوسیدہ سی مارکیٹ میں سے چیونگم کے دو پیکٹ لے کر واپس جا رہا تھا۔ مجھے تمام چیزیں اپنے سے ہٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان تمام مقامات پر میری زندگی وا ہوئی تھی لیکن ہر ایک سے رشتہ ٹوٹا ٹوٹا سا محسوس ہو رہا تھا۔ ہر طرف اتنے لوگ تھے جو میرے اور شہر کے درمیان ربط کو مخل کر رہے تھے۔ میں بیگانگی کے خوف سے جلدی جلدی اپنے فلیٹ پر پہنچ گیا تھا اور یوں محسوس ہونے لگا کہ میں وہی یونیورسٹی کا طالب ہوں جو ہر طرح کے خدشات اور خواہشوں سے معمور تھا اور ابھی بھی بہت کچھ کرنے کی ہمت رکھتا ہوں جیسے ۶۰ برس کی عمر درمیان میں نہیں ہے۔

پینشن پر آنے کے بعد میں اپنی نئی زندگی شروع نہیں کر سکا۔ اگلا دن شروع ہو چکا ہے۔ میرا نو عمر ملازم سویا ہوا ہے۔ میں معمول کے مطابق کچن میں جا کر چائے بنا کر پیتا ہوں' ایک سگرٹ سلگا کر دن کا آغاز کرتا ہوں' پھر ہلکی پھلکی ورزش کرتا ہوں۔ میں جس فلیٹ میں رہتا ہوں یہ ۲ بڑے اور ۱ چھوٹے کمروں پر مشتمل ہے۔ یہ دوسری منزل پر واقع ہے۔ اس کی جانب مغرب ایک دریچہ ہے جو عدالت عالیہ کی نو آبادیاتی عمارت کی طرف کھلتا ہے۔ درمیان میں کبھی کافی بڑا پلاٹ تھا جس پر بیشمار لوگوں نے ناجائز کوارٹر بنائے ہوئے تھے۔ ان میں رہنے

والے چھوٹے موٹے کام کرتے تھے اور جس آبادی میں میرا فلیٹ واقع ہے وہاں گھروں میں بھی کام کرتے تھے۔ شہر کو خوبصورت بنانے اور سرکاری زمین پر ناجائز قبضہ ختم کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کے بعد یہاں کے لوگوں کو شہر سے دور مفت رہائشی کوارٹر دیئے گئے اور اس خالی جگہ پر ایک ۱۳ منزلہ بینک کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ اس عمارت نے میرے منظر میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ وگرنہ اس دریچے سے میں نے شہر کی شاہراہ پر ہر حکومت کے خلاف جلوس دیکھے ہیں، اور اپنی طرف سفر کرتی ہوئی ٹیر گیس کو بھی سونگھا ہے۔ اگر میں اب گھر سے باہر نہ نکلوں تو مجھے نہیں پتہ کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ میرے فلیٹ اور بینک کی عمارت میں کل ۱۵ فٹ کا فاصلہ ہے اور میرے دریچے کے عین سامنے بینک کی نوٹ جلانے کی دو بھٹیاں ہیں۔ جب یہاں کرنسی کے نوٹ کسی زہریلے مواد کے ساتھ جلائے جاتے ہیں تو زرد دھواں بادل کی طرح بل کھاتا ہوا اس آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے، ساری آبادی اپنے پھیپھڑوں کو بچانے کے لئے در اور دریچے بند کرنے لگتی ہے۔ اس بارے میں سب نے حکام سے رابطہ قائم کیا، اخباروں میں خبریں بھی شائع کروائیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا اب ہفتہ میں ۲ کی بجائے ۴ دن نوٹ سوزی کی جاتی ہے۔ اس سے بچنے کے لئے ساری آبادی دن بھر حفاظتی اقدام لیتی رہتی ہے۔ کچھ لوگ تو اپنے فلیٹوں کو تالہ لگا کر دوسری آبادیوں میں نکل گئے ہیں۔ دراصل یہ فلیٹ کمرشل علاقے میں واقع ہیں اور ان کے ارد گرد دکانیں ہی دکانیں ہیں اس لئے کاروباری لوگ اپنے گوداموں اور دفاتر کے لئے ان فلیٹوں کی طرف للچائی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ چونکہ یہ اوقاف کے فلیٹ ہیں اور ان کا کرایہ بہت کم ہے، جن کو مناسب پگڑی مل جاتی ہے وہ اس کی ملکیت دوسرے کے حوالے کر کے نکل جاتے ہیں۔ لیکن یہاں کے مکین بھی اپنی عادتوں کے پکے ہیں۔ ابھی تک صرف دو نے یہ فلیٹ

چھوڑ دیئے ہیں کیونکہ ان کو کاروبار کے لیے روپیہ درکار تھا جو انہیں کہیں سے نہیں مل رہا تھا چنانچہ انہوں نے اپنے فلیٹوں کو پگڑی پر دے کر دم لیا۔

اوہ میں کن خرافات میں کھو گیا ہوں۔ یں سفید کاغذ اور بلیک مارکر سے اپنی سوانح عمری لکھنا چاہتا تھا لیکن ذہن نہ جانے کہاں کھسک گیا۔ یہ میری پرانی بیماری ہے جب بھی کوئی کام شروع کرتا ہوں اور زیادہ سے زیادہ انہماک پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو کوئی کام یاد آ جاتا ہے اور میں اس کی طرف ملتفت ہو جاتا ہوں، دراصل میں اپنی سوانح عمری لکھ کر اسے چھپوانا نہیں چاہتا، بہت سے سفید کاغذ کالے کر کے یہ حساب کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے عمر بھر کیا کیا ہے۔ میں ایک طرح کی معروضیت پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں نے کون سی مہمات سر کی ہیں۔ ایک عام سی بے کیف زندگی جس میں ایک ہی کام کو عمر بھر کرتا رہا ہوں۔ میں نے کچھ کھویا ہے نہ پایا ہے۔ اس لئے میری زندگی ہونے اور نہ ہونے کے درمیان رہی ہے۔ اس قسم کے قنوطی خیالات میرا محاصرہ کر کے مجھے رنجیدہ کر دیتے ہیں، میں انہیں جھٹک کر مارکر کی بجائے اپنا قیمتی پین نکالتا ہوں جو میں نے ۲۰ برس پہلے خریدا تھا، چونکہ یہ قیمتی ہے اس لئے سوچا جب اچھا موقع آئے گا تو میں پھر اس سے لکھوں گا بس اسی سوچ میں ۲۰ برس گزر گئے۔ اب اس سے بہتر اور کون سا موقع ہو سکتا ہے کہ میں اپنی سوانح عمری لکھوں اور وہ بھی اس پین سے جو بیداغ ہے جس کی نب سے ابھی تک کوئی جھوٹ یا سچ رقم نہیں ہوا۔ اس لئے میرے پین کو کسی قسم کی عادت نہیں ہے۔ پین بھی عجیب شخصیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ بعض پینوں کو جھوٹ لکھنے کی اتنی عادت ہوتی ہے کہ ان میں بے پایاں روانی آ جاتی ہے اور جب وہ کوئی سچ لکھنا چاہتے ہیں تو اٹک جاتے ہیں، ان کی سیاہی خشک ہو جاتی ہے۔

مجھے اپنی سوانح عمری کا آغاز اپنے بچپن سے کرنا چاہیے لیکن جب کچھ سوچتا

ہوں تو سب کچھ بجھا بجھا لگتا ہے۔ دراصل میرا بچپن اتنا دور جا چکا ہے کہ اس کی کشش ختم ہو گئی ہے' کیسا زمانہ آ گیا ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے فوری حال کے بارے میں سوچتا ہے۔ میں بچپن کو اس کی مبہم دہلیز پر چھوڑ کر اپنی جوانی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ عورت زندگی کا ایک دلچسپ موضوع ہے۔ میں نے بھی اپنے خیالوں میں ایک درجن لڑکیوں اور عورتوں سے محبت کی ہے' بلکہ اس سے دو قدم آگے بھی گیا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ صبح کو مجھے اپنا پاجامہ تبدیل کرنا پڑتا تھا' اور سارا دن ذہن میں ایک طرح کی بیزاری چھائی رہتی۔ میں بات کو زیادہ آسان بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں جس دنیا یں رہتا ہوں اس میں عورت اور آدمی کو نکاح کرائے بغیر ملنے کی آزادی نہیں ہے' جو اس کے بغیر ملتے ہیں وہ بلاوجہ اپنے لئے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ عورت ایک نوع ہے اور کسی بھی عورت کو پکڑ کر اسے خصوصی بنایا جا سکتا ہے۔ یہ بحث پیچیدہ ہے۔ میں نے اپنے تئیں اس بارے میں کچھ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ میری ماں نے اپنے رشتہ داروں میں ایک عام سی لڑکی سے شادی کر دی۔ ایک سال کے بعد ہی ہمارے مزاجوں میں فرق نمایاں ہونے لگا۔ پہلے کبھی کبھار اور بعد میں ایک تواتر کے ساتھ میں اور بیوی ایک دوسرے کو عمر بھر برا بھلا کہتے رہے۔ اس کی وجوہات تو بہت سی تھیں' تاہم ان میں دو زیادہ اہم تھیں: ایک تو وہ اچھی اور آرام دہ زندگی چاہتی تھی اور دوسرے یہ کہ اس کا ٹونے ٹوٹکوں پر بہت زیادہ اعتقاد تھا' گھر میں ہر جگہ تعویذ لٹکے رہتے' میں چونکہ وہابی عقیدے کا تھا اس لئے میں اعتراض کرتا رہتا۔ لیکن میں نے مصالحت کر لی کہ عقیدے کے بارے میں بحث نہیں کرنی چاہئے۔

چنانچہ میں نے مصالحت کر لی۔ میرا ایک لڑکا ڈاکٹر ہے اور دوسرا ایک الیکٹرونکس کا انجینئر ہے۔ دونوں اسی شہر میں رہتے ہیں۔ ان کی ماں یعنی میری

بیوی ان کے پاس رہتی ہے' دونوں شادی شدہ ہیں۔ میں ۵ سالوں سے اس فلیٹ میں رہتا ہوں اور ایک نو عمر ملازم میری خدمت کرتا ہے کبھی میں خود کھانا پکا لیتا ہوں اور کبھی بازار سے۔ میں اس طرح بہت سی مشکلات سے بچ گیا ہوں۔ میری پنشن میرے لئے کافی ہے۔

میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لیا ہے کہ آج میں اپنی سوانح عمری کے چند اوراق ضرور لکھوں گا۔ مجھے جلدی یہ ہے کہ دن بدن میرا حافظہ کمزور ہوتا جا رہا ہے اور اس انتظار میں یہ نہ ہو کہ میری یادداشتیں محو ہو جائیں اور میں خالی ذہن کے ساتھ زندگی بسر کروں۔ میں نے کاغذ کی پیشانی پر ۷۸۶ لکھ لیا ہے اور ذہن کو آمادہ کرنے کے لئے یکے بہ دیگرے ۲ سگرٹ بھی پی چکا ہوں' قلم کاغذ کو چھوتا ہے اور پھر خود بخود ہی پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کیونکہ ملازمت کے زمانے میں انگریزی اور اردو میں بنائے گئے میرے ڈرافٹ بہت مشہور تھے' کوئی افسر اس میں اضافہ نہیں کرتا تھا۔ لیکن جب اپنے بارے میں لکھنے کی باری آئی تو قلم میں لکنت آ گئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ کہیں میں اپنے آپ سے خائف تو نہیں ہوں کہ اپنے آپ کو اپنی ذات سے باہر نکلنے سے گھبراتا ہوں۔ میرا سر بھاری ہو گیا ہے۔ ابھی تو صرف ۱۱ بجے ہیں۔ میں ایک دم جھٹکے کے ساتھ اٹھتا ہوں جیسے مجھے کچھ یاد آ گیا ہے۔

"اوہ آج پہلی تاریخ ہے اور مجھے خزانے میں اپنی پنشن کے لئے جانا ہے' اس طرح وہاں کچھ لوگوں سے ملنے کا موقعہ بھی مل جائے گا۔"

میں اپنی گلی سے باہر مرکزی شاہراہ پر آ گیا ہوں۔ مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی ہے کہ میرے ہمسایہ میں واقع بینک کے گرد خاردار آہنی تار کی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ چاروں طرف پولیس کا پہرہ ہے اور کمانڈوز کلاشنکوف لئے بڑی حرکت میں ہیں' بینک کے پاس سرکاری کاروں اور جیپوں کا ہجوم ہے۔ میں یہ منظر

دیکھ کر سہم گیا ہوں اور حفاظت کے طور پر ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا ہوں۔ بینک کے آس پاس لوگوں کا ہجوم ہے۔ کافی دیر یہ منظر دیکھنے کے بعد میں ہمت کر کے اس ہجوم کے پاس یہ دریافت کرنے کے لئے پہنچا ہوں کہ ماجرا کیا ہے۔

"بھائی صاحب، کوئی تخریب کاری کا مسئلہ ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے ایک بزرگ سے پوچھا ہے۔ اس نے جواباً بڑے تحیر سے میری طرف دیکھا ہے۔

"آپ اس شہر میں نووارد ہیں؟"

"جی نہیں اس شہر کا رہنے والا ہوں۔"

"خوب پھر آپ کو پتہ نہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔"

جناب میں تو دفتری آدمی تھا، مجھے کیا پتہ کہ شہر میں کیا کیا تبدیلیاں ں پیدا ہوئیں، میں شام کو گھر واپس آیا کرتا تھا۔"

نامعلوم شخص نے میری کتھا سن کر دوسری طرف منہ کر لیا ہے اور صرف اتنا کہا ہے۔

"آج تنخواہیں تقسیم ہونی ہیں۔"

"یہ تو ہر مہینے ہوتی ہیں، اس میں خطرے کی کیا بات ہے، ایک مدت سے یہ کام چل رہا ہے۔"

"واہ بھئی، تمہیں یہ بھی نہیں پتہ کہ اب دن دیہاڑے تنخواہیں لوٹ لی جاتی ہیں۔"

اس شخص نے میری طرف توجہ کئے بغیر کہا ہے، اور میں یہ سوچنے لگا ہوں کہ سکوٹر، پیدل، موٹروں اور بسوں میں ہر روز سفر کرنے والے لوگ وہی ہیں جو اسی شہر میں رہتے ہیں، جب جلوس جلسہ ہو تو یہ سب لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں لیکن ---میں اسی شش و پنج میں ہوں کہ پینشن آج لوں یا پھر کسی اور دن؟ مجھے

ابھی اپنی سوانح عمری کا پہلا صفحہ لکھنا ہے۔ گھر واپس جانے کے لئے قدم اٹھائے ہیں کہ بینک کی چمنیوں نے زرد دھواں اگلنا شروع کیا ہے اور میرا تنفس بتدریج بھاری ہوتا جا رہا ہے۔

عورت کہانی

محکمہ تعلیم میں چند ایک برس کام کرنے کے بعد میں تعلیم، معلم، علم اور طالب علم سب سے دل برداشتہ ہو گیا ہوں۔ میں اس پیشے سے متعلق لوگوں کی توقیر کرتا تھا۔ میں ان کا ہمدرد بھی تھا کہ یہ بے سہارا طبقہ ہے اور لوگ انہیں ہر معاملے میں کہنی مار کر پیچھے کر دیتے ہیں۔ ان کی مدد کرنی ضروری ہے۔ میری یہ خوش فہمی یا غلط فہمی ایک دو برسوں میں ہی ختم ہو گئی کیونکہ میں انہیں بہت زیادہ زیرک اور مطلب جو پایا۔ جب وہ میرے پاس آتے تو میں جان بوجھ کر علم و ادب کی بات شروع کر دیتا' وہ بات ٹال کر میری تعریف کرنے لگتے۔ ان سے ملاقات کے دوران مجھے پتہ چلا کہ وہ نہ صرف ہمہ وقت ایک دوسرے کی برائیاں کرتے بلکہ ناجائز کاموں کے لئے ہمیشہ تیار رہتے۔ وہ چھوٹی چھوٹی مراعتوں کے لئے اپنے شاگردوں کو استعمال کرتے۔ میرا ایک دوست ہمیشہ ان کی حمایت کرتا "آخر وہ بھی اسی معاشرے کی پیداوار ہیں"۔ طویل ملازمتی تجربے کی وجہ سے مری مردم شناسی کی حس کافی تیز ہے' میں بہت جلدی انسان کو بھانپ لیتا ہوں۔ آدمی ہو یا عورت وہ ہمیشہ دو سطحوں پر بات کرتے ہیں۔ ایک سطح تو وہ ہے جس پر وہ آپ سے بات کر رہا ہوتا ہے اور دوسری سطح ان باتوں کے پیچھے جو بات ہوتی ہے وہ کسی اور طرح سے اپنا اظہار کر رہی ہوتی ہے۔ آدمیوں کی نسبت عورتیں زیادہ

communicative ہوتی ہیں۔ مرد کے سامنے ان کی نگاہیں اور بدن کی حرکات بین السطور گفتگو میں پیہم مصروف ہوتی ہیں۔

چند دن ہوئے میں اپنے دفتر کے کمرے میں سر جھکائے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا کہ کھٹ سے دروازہ کھلا' میں نے ایک دم آنکھیں نیچی کر لیں اور فائل پڑھنے کا بہانہ کرنے لگا۔ تیز خوشبو اور کپڑوں کی سرسراہٹ سے میں نے بن بلائے ملاقاتی کی جنس کا تعین کر لیا تھا۔ مجھے بغیر دیکھے ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ملاقاتی کوئی ادھیڑ عمر کی عورت ہے کیونکہ عمر کے اس حصے میں عورتیں زیادہ اور تیز خوشبوئیں استعمال کرتی ہیں۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ سجی ہوئی تھی جو اصلی تھی اور نہ نقلی بس ایک مسکراہٹ تھی جس سے کچھ اخذ کرنا مشکل تھا۔

"ٹھیک ہے جی' مَیں نے آپ کی بات سن لی ہے اور کاغذات بھی دیکھ لئے ہیں لیکن اس سارے کام کو کم سے کم پندرہ دن لگیں گے" میں نے یہ کہہ کر سر جھکا لیا اور فائل کا مطالعہ کرنے لگا۔

"سر' یہ میرے لئے ایمرجنسی ہے مجھے پندرہ دنوں کے اندر اندر نیروبی پہنچنا ہے۔"

"یہاں پر ایک ایمرجنسی میں رہتا ہے۔ تیسری دنیا ہے ہی ایمرجنسی کی دنیا۔"

میں یہ کہہ کر ٹیلیفون سننے میں مصروف ہو گیا جو حاکم اعلیٰ کا تھا۔ ٹیلیفون سنتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے' میں نے انٹرکام پر اپنے دو ماتحتوں کو طلب کیا اور ایک چٹ پر ایک نام لکھ کر ان میں سے ایک کو دیا۔"

"ان محترمہ کو سرگودھا سے فوراً لاہور تبدیل کرنا ہے اور مجھے یہ حکم ابھی چاہئے ہے' اور پھر ڈسپیچ رائیڈر نے اسے کلب روڈ لے کر جانا ہے"۔ میرے ایک بزرگ ماتحت نے منہ بنا کر کہا۔

"سر اس مضمون کی لاہور میں کوئی نشست خالی نہیں ہے۔"

"پھر اپنی نشست خالی کردو، جس کی سفارش نہیں ہے اسے سرگودھا بھیج دو۔"

میری پیشانی پر پسینے کے قطرے آبلوں کی طرح پھیل رہے تھے میں نے رومال سے چہرہ صاف کیا اور کسی قدر خفت کے ساتھ اپنے سامنے بیٹھی عورت کو دیکھا جو میری پریشانی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"آجکل نوکری کتنی مشکل ہو گئی ہے۔"

مجھے اس کی بات نشتر کی طرح لگی، پیشتر اس کے کہ میں اسے اپنے کمرے سے باہر نکلنے کے لئے کہتا وہ خود ہی سمٹ سمٹا کر کھڑی ہو گئی۔

"سر میں چند دنوں کے بعد آؤں گی، مہربانی کریں۔" اس کی آنکھوں میں میں نے حقیقی التجا کی تحریر پڑھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اس عمر میں بھی اس کا ڈیل ڈول ٹھیک تھا۔ وہ چند قدم چلی اور پھر رک کر پیچھے کی طرف مڑی۔

"سر آپ کے کوئی عزیز قلعہ گوجر سنگھ میں رہتے ہیں؟"۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا، اس کے چہرے پر کچھ مانوسیت سی دکھائی دینے لگی۔۔

"شاید"

"یہ تو اچھی بات ہے"

وہ چلی گئی لیکن اس پرفیوم کی مہک ابھی تک میرے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی اور فائلوں کی باس کچھ دیر کے لئے معدوم ہو گئی تھی۔۔ میرا قلم چلتے چلتے رک گیا۔ یہ عورت اتنی جوان بھی نہیں تھی کہ میں اس کے بارے میں کچھ سوچتا۔ یوں بھی دفتر میں میرا رویہ کچھ اتنا پسندیدہ نہیں ہوتا کیونکہ میں انسان کو بہتر طریقے سے جانتا ہوں۔ یہاں ملازم پیشہ عورتیں آتی ہیں، ناز نخرے دکھاتی ہیں، ہر طرح سے متاثر کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن میں ٹس سے مس نہیں ہوتا

"پھر اپنی نشست خالی کردو، جس کی سفارش نہیں ہے اسے سرگودھا بھیج دو۔"

میری پیشانی پر پسینے کے قطرے آبلوں کی طرح پھیل رہے تھے میں نے رومال سے چہرہ صاف کیا اور کسی قدر خفت کے ساتھ اپنے سامنے بیٹھی عورت کو دیکھا جو میری پریشانی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"آجکل نوکری کتنی مشکل ہو گئی ہے۔"

مجھے اس کی بات نشتر کی طرح لگی، پیشتر اس کے کہ میں اسے اپنے کمرے سے باہر نکلنے کے لئے کہتا وہ خود ہی سمٹ سمٹا کر کھڑی ہو گئی۔

"سر میں چند دنوں کے بعد آؤں گی، مہربانی کریں۔" اس کی آنکھوں میں میں نے حقیقی التجا کی تحریر پڑھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اس عمر میں بھی اس کا ڈیل ڈول ٹھیک تھا۔ وہ چند قدم چلی اور پھر رک کر پیچھے کی طرف مڑی۔

"سر آپ کے کوئی عزیز قلعہ گوجر سنگھ میں رہتے ہیں؟"۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا، اس کے چہرے پر کچھ مانوسیت سی دکھائی دینے لگی۔۔

"شاید"

"یہ تو اچھی بات ہے"

وہ چلی گئی لیکن اس پرفیوم کی مہک ابھی تک میرے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی اور فائلوں کی باس کچھ دیر کے لئے معدوم ہو گئی تھی۔۔ میرا قلم چلتے چلتے رک گیا۔ یہ عورت اتنی جوان بھی نہیں تھی کہ میں اس کے بارے میں کچھ سوچتا۔ یوں بھی دفتر میں میرا رویہ کچھ اتنا پسندیدہ نہیں ہوتا کیونکہ میں انسان کو بہتر طریقے سے جانتا ہوں۔ یہاں ملازم پیشہ عورتیں آتی ہیں، ناز نخرے دکھاتی ہیں، ہر طرح سے متاثر کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن میں ٹس سے مس نہیں ہوتا

کیونکہ یہ بناوء سنگھار ناز نخرے ایک خول ہوتا ہے۔ اصل غایت کچھ اور ہوتی ہے۔ عورت ہمیشہ مطلب کے لئے ملتی ہے۔ میرے ایک دوست کے مطابق عورت کی جانب سے کی جانے والی محبت ذاتی تحفظ کے لئے پہلا قدم ہوتا ہے۔ یہ باتیں اس عورت کے جانے کے بعد میرے ذہن میں اٹھ رہی تھیں۔ مجھے معا احساس ہوا کہ اس عورت کا ناک نقشہ میرے ننھیال کے لوگوں سے کچھ ملتا جلتا ہے۔ اس کے نام سے میرے ذہن میں بجھا ہوا ماضی انگڑائی لینے لگا۔

میں اپنے ننھیال کو ایک مدت سے بھول چکا تھا۔ ان سے میری رشتہ داری بھی برائے نام تھی۔ وہ زندگی میں کسی خاص حیثیت کے مالک نہیں تھے اس لئے میرے والد انہیں زیادہ نزدیک نہ آنے دیتے۔ سال میں ایک یا دو مرتبہ مری ماں اپنے بچے کھچے رشتہ داروں کو ملنے چلی جاتی۔ قلعہ گجر سنگھ کو رنجیت سنگھ کے بعد کسی سکھ جرنیل نے آباد کیا تھا۔ یہ خالص سکھوں کی آبادی تھی اس میں مسلمان کیسے آ گئے اور پھر میرے ننھیال ایک گاؤں سے اٹھ کر اس آبادی میں کیوں چلے آئے؟ میں یہاں اپنی جڑیں تلاش نہیں کر رہا کیوں یہاں جڑوں کا مسئلہ گڑبڑ ہے۔ اس خطے میں اتنی زیادہ نسلیں آباد ہوئی ہیں کہ کسی جڑ کا سرا ہی نہیں ملتا۔ نہ ہی یہ میرا ناستالجیا ہے کہ میں اس پرفیسرانی سے کوئی رشتہ جوڑنا چاہتا ہوں۔ عورتوں سے نہ ہی رشتہ جوڑا جائے تو بہتر ہے کیونکہ اس میں تنگی ہوتی ہے۔ آخر میں ہر عورت عورت ہی نکلتی ہے جسے برداشت کرنے کے لئے بہت حوصلہ چاہئے ہے۔ اس تعصب کے باوجود میرے ذہن میں کینیا کا شہر نیروبی کچھ دیر کے لئے اٹک گیا۔ میرا ایک خالہ زاد بھائی کسی زمانے میں نیروبی گیا تھا، اس کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ وہاں کا ایک پاکستانی تاجر اسے ملازمت کے سلسلے میں ساتھ لے گیا تھا، اسے اپنے کاروبار میں شریک کر لیا۔ ایک دو برس بعد اس نے اپنی بہن کی شادی اس سے کر دی۔ میرے ننھیال میں اس شادی پر بہت لے

دے ہوئی تھی۔ میری خالہ نے بہت گریہ کیا کیونکہ وہ اس کی واحد اولاد تھا، وہ اس کا سہارا نہیں تھا کیونکہ وہ خود بیکار تھا اور کئی سالوں سے نوکری کے لئے در بدر پھر رہا تھا۔ میری خالہ کی کفالت اس کا سسرال کرتا تھا کیونکہ اس کی شادی اپنے چچا زاد بھائی سے ہوئی تھی۔ اس کا چچا اپنے خاندان سمیت اسی حویلی کے ایک حصے میں رہتا تھا۔ میری خالہ کا خاوند شادی کے دوسرے برس بعد کار کے حادثے میں مر گیا تھا اور اس کی نشانی اس کا بیٹا یعنی میرا کزن تھا جو ماں کو تنہا چھوڑ کر نیروبی چلا گیا تھا اور اپنی شادی پر اپنی ماں کو نہیں بلایا تھا۔ ننھیال میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اس نے اپنا کاروبار شروع کیا تھا اور وہ بہت امیر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کے واقعات کا مجھے علم نہیں ہے کیونکہ میرا ننھیال میں آنا جانا نہیں تھا۔

کچھ دن بعد میں ٹمپل روڈ پر سے گزر رہا تھا کہ کسی نے ہاتھ کے زور دار اشارے سے میری کار کو روکنا چاہا، میں نے کار روکی تو ایک سفید بالوں والا دبلا پتلا آدمی مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ میری کار کے قریب آ گیا، اس کی مسکراہٹ دوستانہ تھی، میں اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ میری بدحواسی یا حافظے کی کمزوری بھانپ گیا تھا۔۔۔

"میں اشرف ہوں، آپ کا خالہ زاد بھائی" میں جھینپ کر کار سے باہر نکلا، ظاہری گرم جوشی دکھائی اور معذرت بھی کی کہ ایک مدت کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ وہ کسی زمانے میں کسی صوبائی سیکرٹری کا پی اے تھا اور اس نے ملازمت چھوڑ کر کاروبار شروع کر دیا تھا۔

"یہ سامنے ہے میری دکان، چلو اندر چلیں" اس نے تپاک سے کہا۔ میں دکان کے اندر جانے میں متامل تھا۔

"میں پھر کبھی آؤں گا، دفتر میں بہت تھک گیا تھا لیکن آپ نے مجھے روکا کیوں

ہے؟ خیریت ہے؟۔

"میں نے بس آپ کی طرف آنا ہی تھا' ایک چھوٹی سی سفارش کرنے۔" میں تھوڑا سا پھیکا پڑ گیا کیونکہ میں سفارشوں سے بہت گھبراتا ہوں۔

"ہاں ہاں کہیے" میں نے خالص دفتری انداز میں کہا۔۔

"روبی مجھے تین چار مرتبہ آپ کے پاس جانے کے لئے کہہ چکی ہے' بس دکان سے فرصت ہی نہیں ملتی" میرا چہرہ سپاٹ تھا۔۔

"اس دن وہ آپ کے دفتر این او سی لینے گئی تھی آپ نے اسے پہچانا نہیں" میرا چہرہ حسب سابق کی طرح سپاٹ تھا۔ میں ساری رشتہ داریاں بھول چکا تھا۔۔

"آپ کسی عورت کا ذکر کر رہے ہیں؟

"ہاں تایا حمید کی نواسی روبی'' حمید کی بیوی' آجکل وہ ایک کالج کی پرنسپل ہے۔"

"حمید کی شادی تو نیروبی میں ہوئی تھی۔"

میرا کزن مسکرایا" آپ کو ان باتوں کا بالکل پتہ نہیں' حیرت ہے' ہم ایک دوسرے کو کیسے بھولتے جا رہے ہیں۔"

"رشتہ داریاں بھی تو میل ملاقات سے قائم رہتی ہیں۔ جب سے والدہ کا انتقال ہوا ادھر سے کبھی کوئی آیا گیا ہی نہیں' اس بات کو بھی ایک زمانہ بیت گیا ہے۔"

میرا کزن میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی دکان کے اندر لے گیا اور میں ہیٹروں اور گیزروں کی کرخت فضا میں قدرے بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن روبی کے بارے میرا تجسس بڑھنے لگا تھا' اس کے چہرے پر مانوسیت کی جو لکیر تھی مجھے اس کی وجہ سمجھ آنے لگی۔ میرے کزن نے میری خاطر و مدارات کرنے کی کوشش کی لیکن میں خالص دفتری انداز میں انکار کر دیا۔ اس مرتبہ میں نے بات کرنے

میں پہل کی لیکن ہمیں ایک دوسرے کی گفتگو سننے میں کافی دقت پیش آ رہی تھی کیونکہ سڑک پر ٹرانسپورٹ اور خاص طور پر رکشاؤں کا شور صور اسرافیل کو بھی مار بھگانے کے لئے کافی تھا

"اشرف صاحب' ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ حمید کی شادی تو نیروبی میں ہو گئی تھی اور سنا تھا کہ اس لڑکے بھی جوان ہیں لیکن روبی سے شادی۔۔؟

میرے کزن اشرف نے قہقہہ لگایا اور میں اس قہقہے کی تہہ تک نہ پہنچ سکا کہ یہ مسرت کا قہقہہ تھا یا تمسخر کا؟" "بھائی صاحب یہ ہیر رانجھے کا قصہ ہے۔" میں اس کی بات نہ سمجھ سکا۔

"آجکل ہیر رانجھا کہاں؟ رانجھا مہنگائی کے ہاتھوں فرار ہو چکا ہے اور ہیر بیوٹی پارلر میں گئی ہے۔" میں نے اسے جواب دیا۔

"سب کچھ بدل گیا ہے لیکن اب بھی کچھ احمق اس دنیا میں ہیں۔ اچھا ترسوں وہ آپ کے پاس آئے گی اسے NOc دے دیں"

"مل جائے گا' آپ نے سفارش جو کی ہے۔ یہ ہیر رانجھے کا چکر کیا ہے؟

ہے تو یہ لمبی کہانی اور آجکل کے زمانے میں یہ کچھ عجیب بھی لگتی ہے۔ آپ کو علم ہی ہے کہ حمید اور روبی کزن ہیں' دونوں ایک ہی حویلی میں جوان ہوئے۔ کسی کو وہاں کانوں کان خبر نہیں تھی کہ دونوں میں محبت کا کھیل ایک مدت سے چل رہا تھا۔"

"کزن سے محبت بڑی عجیب سی بات ہے۔" میں نے جملہ لگایا۔

"بھائی صاحب آپ ماڈرن قسم کے لوگ ہیں۔ خیر روبی کی شکل اچھی تھی' اب تو ملبے کا ڈھیر ہے' اس کے بہت سے رشتے آتے لیکن وہ انکار کر دیتی۔ اس کا باپ سکول ٹیچر تھا وہ ابھی ایف اے میں تھی تو وہ فوت ہو گیا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ اسی حویلی میں آ گئی۔ اس کا سارا بچپن اسی حویلی میں گزرا۔ اس کے باپ

کی جب باہر تعیناتی ہوئی تو وہ انہیں ساتھ لے گیا تھا۔ روبی کا نانا اور اس کے بیٹے ہی ان ماں بیٹی کا دھیان رکھتے تھے۔ انہوں نے اسے شادی کے لئے مجبور کیا وہ ٹال گئی کہ اس نے ابھی معاشیات میں پی ایچ ڈی کرنی ہے۔ اسی دوران اسے لیکچرر کی ملازمت مل گئی اور دوسرے شہر میں چلی گئی۔ اتفاق سے کچھ دنوں بعد حمید بھی نیروبی چلا گیا۔

"یہ تو کوئی غیر معمولی کہانی نہیں ہے" میں نے کہا اور اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا۔

آپ کو جلدی ہے تو میں کہانی مختصر کر دیتا ہوں۔ اس واقعہ کو کافی برس بیت گئے۔ روبی کی عمر چالیس برس ہو گئی تھی اور اس کی شادی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ حمید اس سے دس برس بڑا تھا اس دوران اس کی ماں بھی سسک سسک کر مر گئی لیکن روبی شادی کے لئے نہ مانی۔ ایک رات دیکھا کہ حمید کاندھے پر تھیلا لٹکائے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ میں اسی حویلی کے دوسرے ونگ میں اپنے نانا کے پورشن میں رہتا تھا کیونکہ میری والدہ بیوہ ہو کر اسی حویلی میں واپس آ گئی تھیں۔ حمید جب یہاں حویلی میں رہتا تھا اس سے میری گپ شپ تھی۔ لیکن اتنے سالوں کے بعد اس کا یکایک آنا میرے لئے حیرت سے کم نہیں تھا۔ وہ ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اگلے دن میں ہوٹل میں گیا۔ وہ بیٹھا بیئر پی رہا تھا۔ جوانی حمید کا ساتھ چھوڑ گئی تھی، اس کا حسن چہرے کی لکیروں میں بٹ گیا تھا۔ کافی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے یک دم کہا۔۔

میں یہاں روبی سے شادی کرنے آیا ہوں، میری آمد کا کسی کو علم نہ ہو، میں اسی لئے گئی رات کو حویلی میں آیا تھا۔"

کیا باتیں کرتے ہو، اپنی عمر دیکھو، تمہارے بچے جوان ہیں، روبی کو اس بات کا

علم ہے؟"

"ہاں کبھی کبھار اس کا خط آتا ہے اور میں جواب بھی دیتا ہوں۔ اس کا ایک خط میری بیوی کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اس کے بھائیوں نے میرا پاسپورٹ اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ میں نے دوسرا پاسپورٹ بنوا لیا ہے، کسی کو علم نہیں میں کہاں ہوں سب مجھ ڈھونڈ رہے ہوں گے۔"

"یار تم تو بڑے ڈرامائی آدمی ہو۔ اب کیا چاہتے ہو۔"

پرسوں اسی ہوٹل میں میری اور روبی کی شادی ہو گی، تم دو تین دوست لے آنا۔"

"شادی تو ہو جائے گی پر روبی کہاں رہے گی؟"

تم اس بات کو چھوڑو، یہ میرا معاملہ ہے۔ میں نے یہاں صرف دس دن رہنا ہے جس میں سے ایک دن گزر گیا ہے۔

مجھے اس ساری کاروائی اور ایک انہونے واقعہ کی منطق سمجھ میں نہ آئی۔ اس کی شادی کا انحصار میرے تعاون پر تھا کیونکہ وہ یہ سب کچھ چوری چھپے کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھایا۔۔

"دیکھو اگر تم بات کھل کر نہیں کرو گے تو میں اس شادی....

"لو سنو، میں نے اور روبی نے قران اٹھایا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے شادی کریں گے اور اگر نہ کر سکے تو پھر شادی نہیں کریں گے۔ میں مجبوری کے عالم میں اس حلف پر قائم نہ رہ سکا لیکن اس نے اپنے حلف کی عزت کی، میں اب اپنی حلف پورا کرنے آیا ہوں، پہلے ہی بہت سال بیت گئے ہیں۔۔"

"تو بھائی صاحب ان کی شادی ہو گئی اور وہ دس دن اس ہوٹل میں اپنی بیوی کے ساتھ رہا۔ جب رشتہ داروں کو پتہ چلا تو سارے ہکے بکے رہ گئے۔ اس کا خیال تھا کہ نیروبی میں کسی کو اس معاملے کا پتہ نہیں چلے گا۔ لیکن اس کے نیروبی

جانے سے پہلے بات وہاں پہنچ چکی تھی۔ اس کے سسرال نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا اس کے بارے میں اس نے مجھے ایک تفصیلی خط لکھا۔ انہوں نے اسے کاروبار سے الگ کر دیا۔ اس کے بیٹوں کو اس کے کاروبار پر بٹھا دیا' اسے اپنے بنگلے سے نکال دیا اور اس کا کچھ ماہانہ خرچہ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد کے واقعات کا مجھے نہیں پتہ۔ چند سال پہلے اطلاع آئی تھی کہ وہ ہارٹ اٹیک سے فوت ہو گیا تھا۔"۔

" ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ روبی نے دس دنوں کے لئے شادی کیوں کی؟"

"جب وہ این او سی لینے آئے گی تو اس سے پوچھ لیں۔"

" بھائی صاحب میں روبی کا کام کردوں گا' اجازت" میں یہ کہہ کر کرسی سے اٹھ گیا۔

"چند لمحے اور ٹھہریئے اس کہانی کا آخری حصہ باقی ہے۔

"اس کے بعد پھر کیا ہوتا؟" میں نے پوچھا

" اس کے بعد یہ ہوا کہ روبی کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام بھی اس نے اپنے خاوند کے نام پر رکھا۔ یہ لڑکا بھی اسی حویلی میں رہتا تھا' بالکل باپ کی تصویر تھا۔ روبی مختلف شہروں میں نوکری کرتی رہی آجکل وہ ایک سال کی چھٹی لے کر آئی ہے۔"

" لیکن اب وہ نیروبی جا کر کیا کرے گی؟

میرے کزن نے مسکرا کر کہا" اسے قسمت یا حالات کا پھیر کہتے ہیں۔ روبی کا بیٹا بھی باپ کی طرح بی اے کر کے ایک سال تک بیکار پھرتا رہا۔ پھر کسی نے اسے پٹی پڑھائی کہ نیروبی میں اس کے باپ کی جائیداد ہے اور وہ وہاں جا کر اپنا حصہ کلیم کر سکتا ہے۔ اس نے روبی کو یہ بات بتائی اور اس نے بیٹے کو لعن طعن کی۔ پھر

ایک دن روبی نے دیکھا کہ اس کا بیٹا غائب ہے' اس نے سوچا اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں آوارہ پھر رہا ہو گا۔ لیکن اس کا لڑکا گھر واپس نہ آیا' اسے احساس تھا کہ وہ بیکاری سے تنگ آچکا تھا اور کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے راہ دکھائی۔ وہ ایک ہفتہ کنیا کے سفارتخانے کے چکر لگاتی رہی' آخر انہوں نے تصدیق کر دی کہ اس کا بیٹا نیروبی میں حفاظت سے ہے اور ایک الیکٹریکل کمپنی میں کام کر رہا ہے۔ اس کا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں وہ ان لوگوں کے چنگل میں نہ آجائے' اس لئے وہ نیروبی جا کر اسے واپس لانا چاہتی ہے۔"

میں ایک دن اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ایک دم میری طبیعت کام سے اچاٹ ہو گئی' سوچا کہ کسی ریستوراں میں جا کر کافی پیئوں اور کچھ دیر سستا لوں۔ ابھی اسی سوچ میں تھا کی دھیرے سے میرے دفتر کا دروازہ کھلا' اندر آنے والے سے پہلے بھاری بھرکم خوشبو کا جھونکا اندر داخل ہوا' میں جان گیا اور سر ایک آدھ موئی سی فائل پر جھکا دیا' میں نے اسے ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایک پل کے لئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر گہری افسردگی اور خاموشی کی لکیریں مختلف زاویوں سے پھیلی ہوئی تھیں' اس کے ہاتھ میں ایک درخواست تھی' میں سر اٹھا کر اس کی طرف متوجہ ہوا' اس نے گھٹی ہوئی میں میری طرف کاغذ بڑھاتے ہوئے کہا۔

" میں اپنی این او سی کی درخواست واپس لینا چاہتی ہوں ' اب اس کی ضرورت نہیں۔۔" اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی موٹی سی لکیر تھی۔

"کیوں؟"۔

اس نے سر جھٹک کر حیرت سے مجھے دیکھا پھر ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے گرد پھیل گئی جس سے اس کے اور میرے درمیان فاصلہ ختم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

"وجہ تو نہیں بتا سکتی' وہ وہیں کا ہو گیا ہے' یہ قسمت کا چکر ہے یا واقعات کی تکرار

"آپ تنہا رہ گئی ہیں؟ اس نے وہاں شادی کر لی ہے؟"

"جی"۔

"کہاں؟"۔

"جہاں اس کے باپ نے کی تھی۔"

وہ یہ کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھی' میں اسے روکتے ہوئے بھی نہ روک سکا' میرے ذہن میں بہت سے سوالات تھے۔۔۔۔

انمونا واقعہ

جدھر نگاہ جاتی ہے مکان اور کوٹھیاں ہی کوٹھیاں ہیں' ہر مکان اور کوٹھی کے دریچے باہر کی طرف کھلتے ہیں اور شام ہوتے ہی یہ دریچے ایک ایک کر کے بند ہو جاتے ہیں۔ کوٹھیوں اور مکانوں کے مکیں تھکے ہارے پیدل' سکوٹروں اور کاروں پر بریف کیس تھامے' خالی ٹفن کیریئر اٹھائے ہوئے ان گھروں میں واپس آتے ہیں' بعض خوشیوں سے معمور ہوتے ہیں اور کچھ بد نصیبی ساتھ لاتے ہیں۔ ابھی ابھی ایک وسیع و عریض کوٹھی میں ایک سبز رنگ کی کار لڑھکتی ہوئی دھیمہ شور کرتی کوٹھی کے اندر واقع ایک انیکسی میں کھڑی سرخ رنگ کی کار کے پیچھے آ کر رکی ہے۔ سبز کار میں کسی نے سگریٹ سلگایا ہے اور دھوئیں کا ایک مرغولہ واضح طور پر کھڑکی سے بل دار سیڑھی کی طرح باہر نکلتا ہوا اس کوٹھی کے وسیع و عریض لان کی طرف سفر کرنے لگا ہے' لان کے پیچھے ایک خاموش دو منزلہ کوٹھی کے کسی دریچے کسی نے بھی سبز کار کا نوٹس نہیں لیا ہے۔

"میں رشتوں میں قید ہوں' اس انیکسی کی چار دیواری میں قید ہوں' میرے لئے رہا ہونا ممکن نہیں ہے۔"

سبز کار میں کسی نے اس جملے کو اپنے منہ میں دوہرایا ہے' تیزی سے کار بیک کی ہے جو آہستہ آہستہ باہر فلزاتی سڑک پر دوسری کاروں کے ساتھ چلنے لگی ہے

اور چلتی چلتی ایک ٹیلیفون بوتھ کے پاس رک گئی ہے۔ سبز کار کے سوار نے باہر
نکل کر ٹیلیفون کے اندر دو سکے ڈالے ہیں جو شور مچاتے اس کے حلق سے نکل کر
پیٹ میں جا گرے ہیں' اس نے نمبر ڈائل کیا ہے۔ کچھ دیر تک اس کے کان میں
گھوں گھوں کی آواز سنائی دی ہے' ادھر سے کڑک کی آواز آئی اور اس نے
جلدی سے ٹیلیفون کا کریڈل ہک کے ساتھ لٹکا دیا ہے۔"

"شکر ہے اسے نہیں پتہ چلا کہ ٹیلیفون کے ادھر میں ہوں۔" اس نے سکے باہر
نکالے ہیں انہیں' جیب میں ڈال کر کار کو ایک نامعلوم سفر پر روانہ کیا ہے۔

پچھلا پہر ہے' آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے۔

"ہم یہ جانتے ہوئے کہ زندگی اپنے منطقی انجام کو پہنچ رہی ہے' اور ہم ایک
دوسرے سے مستقبل کا کوئی وعدہ نہیں کر سکتے' سکول کا ماسٹر بھی یہ کہا کرتا تھا کہ
وقت ایک صراط مستقیم ہے جو آگے چلتا ہے اور پیچھے گردن موڑ کر نہیں
دیکھا' ایک دوسرے ملنے کے خواہش مند ہیں۔"

سبز کار اب کاروں کے ہجوم میں کھو جاتی ہے' شام کا اندھیرا تیزی سے قبل از
وقت پھیل رہا ہے۔ سڑک کے ارد گرد مبہوت مکانوں میں یک لخت چوکور اور
مستطیل فریموں میں روشنیاں جھانکنے لگتی ہیں۔

وہ ہفتے میں ایک مرتبہ اس کے گھر جاتا ہے۔ وہ ادھر ادھر کی نامعقول اور
فضول قسم کی باتیں کرتی ہے۔ اس کی نوعمر بیٹی اور بیٹا کچھ کچھ وقفوں کے بعد اس
کے پاس آ کر بیٹھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں' وہ گھبراہٹ میں دیواروں پر اپنے
مرحوم شوہر کی گروپ تصاویر کو دیکھتی ہے اور پھر کسی سیاق و سباق کے بغیر خود ہی
کہتی ہے۔

"میری اولاد کو مجھ پر بڑا اعتماد ہے' انہیں پتہ ہے کہ ہم صرف کلاس فیلو رہے

ہیں' اور کچھ ایسے کام ہوتے ہیں جو صرف مرد ہی کر سکتے ہیں' اس لئے تمہیں
زحمت دے دیتی ہوں۔"

کمرے میں خاموشی چھا جاتی ہے۔ دونوں کے پاس گفتگو کرنے کے لئے کوئی
موضوع نہیں ہوتا اور وہ اس سکوت کو توڑنے کے لئے کہتی ہے۔

"مجھے زندگی سے بہت خوف آتا ہے' میرے والدین نے مجھے سہارا دیا ہے
لیکن سہارا دینا ہی کافی نہیں ہوتا۔"

کمرے میں پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس کے پاس بات کرنے کے لئے بہت
کچھ ہے لیکن وہ ان موضوعات پر بات نہیں کرنا چاہتی۔ وہ صرف ماضی کی ہڈی
چبانے تک اپنے آپ کو محدود رکھتی ہے۔

"یہ محض رومانٹیسیزم ہے جو مستقبل کا انکار ہے۔" وہ ایک پل کے لئے سوچتا
ہے۔

"اچھا بھئی میں چلتا ہوں" یہ کہہ کر وہ ایک دم کمرے سے باہر نکل جاتا ہے وہ
اس کے رکنے کے لئے اصرار نہیں کرتی۔ ہوٹل کے گراؤنڈ فلور پر ایک
ریستوراں اور ڈائننگ ہال ہے۔ مرکزی ہال کا فرش تین فٹ گہرا ہے اور اس
گہرائی میں لابی بنائی گئی ہے۔ لابی کے چاروں طرف کرسیاں' میز' ایش ٹرے
---- سامنے لمبے سے کاؤنٹر پر لٹکتے ہوئے کٹ گلاس کے فانوس۔ مین ہال میں
داخل ہونے کے لئے ایک چوبی گھومتے ہوئے دروازے سے گزرنا ضروری
ہے۔ گھومتے ہوئے ہشت پہلو دروازے میں سے مختلف نسلوں کے لوگ برآمد
ہوئے ہیں۔ دروازے سے باہر ایک سیاہ فام دربان مغلوں کے عہد کی زعفرانی
رنگ کی پوشاک پہنے مبہوت اس گھومتے دروازے کو دیکھ رہا ہے۔ کاؤنٹر پر
ایک سیاہ فام عورت اور ایک سیاہ فام آدمی جھکے ہوئے کچھ لکھنے میں مصروف
ہیں۔ ان کے پاس ایک ستون کے ساتھ گندمی رنگ اور بڑی بڑی مونچھوں والا

سفید وردی میں ملبوس ایک بیرا کھڑا کسی حکم کا منتظر ہے' اوپر سے نیچے اترتی ہوئی سیڑھیوں پر سرخ کوٹوں میں ملبوس سفید دستانے پہنے ہوئے تین سیاہ فام بیرے ہاتھوں میں سرخ کانسی کے طشت اٹھائے ہوئے یکے بہ دیگرے نیچے اتر رہے ہیں۔ لابی میں بیٹھے لوگ باتیں کر رہے ہیں لیکن کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ یوں لگتا ہے وہ کٹ پتلیاں ہیں جو ہاتھوں کے اشاروں اور لبوں کی جنبش سے باتیں کر رہی ہیں۔ لابی میں صرف مرد ہی مرد ہیں' عورتیں نایاب' صرف غیر ملکی عورتیں نظر آ رہی ہیں۔

اس کے سامنے کافی کا گرم پیالہ رکھا ہوا ہے اور کافی میں سے بھاپ ایک عورت کے جسم کے خطوط ہوا میں بناتی اوپر کو اٹھ رہی ہے۔۔۔

"اس کی پورچ میں سرخ کار کھڑی تھی اور اس کا مطلب ہے وہ گھر میں تھی اور جان بوجھ کر باہر نہیں نکلی۔ میں نے ہارن اس لئے نہیں دیا تھا کہ بڑی کوٹھی میں اس کے بہن بھائی رہتے ہیں۔ اسے یہ اجازت ہے کہ وہ اپنے ملاقاتیوں کو مل سکتی ہے۔ اس نے ۲۵ سال بعد مجھے کیسے دریافت کر لیا ہے۔ کالج کے بعد تو ہم مختلف راستوں پر کھو گئے تھے اور یہ امکان بھی نہیں تھا کہ ہم دوبارہ ملیں گے۔ یہ انہونا اتفاق ہے۔" چوبی دروازہ تیزی سے گھوم رہا تھا۔ اسے لگا کہ یہ دروازہ نہیں زمین گھوم رہی ہے' یہ زمین نہیں اس کا ذہن گردش میں ہے۔

ہوٹل کا بیرا ایک کارڈ لے کر آیا ہے' اس کا نام پوچھا ہے' نام بتانے پر بیرے نے کارڈ دیا ہے جس پر اس کے لئے پیغام ہے کہ اس کا ٹیلیفون ہے' اس نے ہاتھ کے اشارے سے بیرے کو واپس جانے کے لئے کہا ہے اور سگرٹ سلگا لیا ہے۔

، سے بیرے کو ٹیلیفون نہ سننے کا اشارہ کر کے سگرٹ سلگا لیا ہے۔

"یہ اسی کا ٹیلیفون ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے اندر سے مجھے دیکھ کر باہر آنے سے انکار کر دیا تھا' پھر اپنی غلطی کا احساس ہوا ہو گا لیکن اسے کیسے پتہ ہے کہ میں اس ہوٹل میں ہوں؟ میں نے اسے بتایا تھا کہ میں اکثر اس ہوٹل میں

جاتا ہوں اور زیادہ وقت گھر بسر کرنے کی بجائے یہاں تنہا بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔"

ہشت پہلو دروازہ پھر تیزی سے گھوم رہا ہے' اس کے اندر کھڑے لوگوں کے چہرے شیشوں میں سے دکھائی دے رہے ہیں۔ رنگ برنگی چھوٹی بڑی کاروں کی طویل قطاریں' ٹریفک جیم' ہارنوں کا سیلاب۔ اس کی کار بہت سی کاروں کے درمیان میں ہے' اس نے ایک دو مرتبہ گھڑی دیکھی ہے" ۔۔۔ دفتر سے اٹھنا محال ہوتا ہے۔ لوگ ہی لوگ' کام ہی کام' بدبخت ڈرائیور نے آج ہی بیمار ہونا تھا اور ٹریفک جیم۔ گیارہ گھنٹے کچھ کھائے پیئے بغیر نان سٹاپ کام۔ کھانے کا وقفہ صرف کاغذوں پر ہے۔ اس کا ٹیلیفون بھی اسی وقت؟ یہ واقعہ ہے' یہ حادثہ ہے میں اسے پہچان بھی نہیں سکا تھا۔ اس میں میرا قصور نہیں تھا' میں تعلیم چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اگر اسے واقعی دلچسپی ہوتی تو مجھے تلاش کرتی۔ سب عورتیں ایک سی ہیں۔ مستقبل اور تحفظ۔ اوہ مائی گاڈ بہت دیر ہو گئی ہے۔ وہ انٹر کام پر بار بار میری غیر حاضری کے بارے میں پوچھ رہا ہو گا۔ اس کے آگے چلتی کاریں غائب ہو چکی ہیں۔ پچھلی قطار سے ہارن سائرن کی طرح بج رہے ہیں۔ اس نے بڑبڑا کر کار سٹارٹ کی ہے۔ ایک دس سالہ لڑکی نے کار کا دروازہ یک لخت کھول کر بستہ کار کے اندر پھینکا ہے۔ اور اس کی کار میں فین بیلٹ گردش میں ہے۔۔۔

دفتر کا چھوٹا سا کمرہ' میز پر بیشمار فائلیں۔ لاتعداد لوگ ایک کے اوپر دوسرا' آوازیں۔ چیخیں۔ تبادلہ' ترقی تنخواہ' سرخ فیتے۔۔ خدارا بس کرو۔ اس نے میز پر ہاتھ مارا ہے۔ "بہتر سلوک کیا جائے۔ ہم اوپر تک جا سکتے ہیں۔" وہ خاموشی سے گھومنے والی کرسی بیٹھ گیا ہے۔ اس کا قلم تیزی سے فائلوں پر چل رہا ہے۔ اس نے ترچھی نگاہ سے سامنے دیوار پر معلق کلاک کو دیکھا ہے۔ چھ بجے ہیں ۔۔۔ اس کا ذاتی معاون ٹیلیفون پر ہاتھ رکھے اونگھ رہا ہے اور نائب قاصد بار بار گھڑی کو دیکھ رہا ہے۔ صبح ۷ بجے سے چھ بجے شام ۔۔۔ میرے گھر سے کسی

نے ٹیلیفون تک نہیں کیا... اس نے ٹیلیفون کا بٹن دبایا.. "تم لوگوں کو چھٹی ہے' میں دیر تک کام کروں گا۔" وہ ایک کے بعد دوسری فائل اٹھاتا ہے' کچھ لکھتا ہے' دستخط کرتا ہے اور فائل قالین پر پھینک دیتا ہے۔ فائلوں کا ڈھیر آہستہ بلند ہو رہا ہے۔ "یہ ڈھیر انہوں نے مجھے دیا ہے جو میں انہیں لوٹا رہا ہوں"۔۔ وہ مسکراتا ہے اور ٹیلیفون کا نمبر گھمانے لگا ہے' اس کی نگاہیں ڈائل کی گردش کا تعاقب کر رہی ہیں" یہ زمین کی طرح گردش کرتا ہے' نہیں قسمت کی طرح گردش کرتا ہے۔" ڈائل گھوم کر پھر صفر کے ہندسے پر آجاتا ہے۔ کمرے میں خاموشی ہے اور اس کے دل کی دھڑکن واضح طور پر سنائی دے رہی ہے۔ "جب میری اس میں دلچسپی واجبی سی ہے تو مجھے اس کے گھر نہیں جانا چاہئے۔ "تم میرے اچھے کلاس فیلو ہو اور ایک بے سہارا کے بہت سے کام کر دیتے ہو' میں اس کے لئے مشکور ہوں"۔ یہ سن کر اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوتی ہیں' وہ کار کو تیزی سے چلاتا ہوا گھر واپس آجاتا ہے اور دوبارہ اس نے نہ ملنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اسے یہ دوستی مشکوک لگتی ہے کیونکہ اس کی بنیاد ضرورت پر ہے۔ "یہ ملاقاتیں بے ثمر ہیں' ہم اس عمر میں ایک دوسرے کو کچھ نہیں دے سکتے۔"

اسے تیزی سے کتاب پڑھنے میں بڑی مہارت ہے' بعض اوقات وہ رات بھر میں ایک ناول ختم کرلیتا ہے۔ اس کی بیوی دیر سے کلینک سے واپس آتی ہے' تھکی ہوتی ہے' کھانا کھا کر سوجاتی ہے' وہ ناول پڑھتے ہوئے کنکھیوں سے بیوی کو دیکھتا ہے پھر اکتا کر سیموں دی بوار کی کتاب "دوسری جنس" قالین پر پھنک دیتا ہے۔ "بیہودہ کتاب ہے' اس میں عورت کی بیالوجی پر بحث کی گئی ہے۔"

تمہاری طرف آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا' راستے میں تمہاری کوٹھی آگئی' ایک پل کے لئے ویسے ہی آگیا ہوں' مجھے تم سے کوئی کام نہیں ہے اور کوئی خاص بات بھی نہیں کرنی

"تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو" میرے لئے ایک آدمی سے محبت اور دوسرے کے ساتھ ایک بیوی کے طور پر رہنا ممکن نہیں ہے۔" یہ بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں دیوار پر معلق اپنے خاوند کی تصویر پر مرکوز تھیں۔"

"میرا یہاں آنا محض ایک حماقت تھی۔ ہم فقط دوست ہیں لیکن عورت اور آدمی دوست نہیں ہوسکتے کیونکہ درمیان میں دو جنسوں کا رشتہ در آتا ہے" اس نے سنجیدگی سے کہا لیکن اس نے جواب دینے کی بجائے ایک سیب کو آدھا کر کاٹ کر اسے دیا تھا۔

اس کا ذہن ایک سست اور خراب گھڑی کی طرح چل رہا ہے۔"

"وہ ہاں اور نہیں کے درمیان ہے' اس سے ملنا بے سود ہے' وہ اپنے کاموں کے لئے مجھے ملتی ہے اور مجھے اس سے کوئی کام نہیں ہے۔"۔ اس کی میز پر رکھا

ایک ٹیلیفون بج رہا ہے۔" جی ہاں آپ کی تعیناتی کل تک ہو جائے گی' وزیر صاحب کے حکم کی تعمیل ہوگی۔ اب سبز رنگ کا ٹیلیفون بج رہا ہے۔ "جی ہاں' میں میٹنگ کا ایجنڈا بھیج رہا ہوں۔" وہ بائیں ہاتھ سے بار بار ٹیلیفون اٹھاتا ہے اور دائیں ہاتھ سے فائلوں پر لکھتا جاتا ہے۔ اس کا پی اے پاس کھڑا فائلیں آگے پیچھے کر رہا ہے۔ پھر ٹیلیفون بجا ہے۔ ______ بیٹی میں سات بجے تمہیں مارکیٹ لے جاؤں گا"۔ اس نے ٹیلیفون نیچے رکھ کر ایک پل کے لئے سوچا کہ سات بجے تو اس نے بلایا ہے' اسے کوئی ضروری کام ہے۔

اس کی کار تیزی سے سڑک پر بھاگ رہی ہے' درخت اور مکان ساتھ ساتھ بھاگ رہے ہیں۔ سامنے گول چکر آگیا ہے' اس نے کار کی رفتار کم کر دی ہے جو ایک بڑی جسیم سی کوٹھی کے باہر رک گئی ہے۔ جس کے اندر سرخ رنگ کی کار کھڑی ہے۔ وہ کچھ دیر کے لئے سوچتا ہے' مرتعش ہاتھوں سے سگرٹ سلگاتا ہے

سناریو

اتنا زیادہ شور ہے کہ شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔

اتنی زیادہ دھول اور دھواں کہ چہروں کی بجائے چہروں کے ہیولے۔۔

اتنے زیادہ لوگ کہ پہچان مشکل۔

بس شاپ پر اتنے زیادہ بیتاب قدم' ایک دوسرے کے لئے اجنبی ' لیفٹ رائیٹ' نازی فوج کی طرح سڑک کا سینہ کوٹتے بھاری بھرکم قدم۔۔

ٹریفک سگنل' ایک بے طاقت حکمران۔

فٹ پاتھ پر ہر عمر کے ۱۹۹ افراد کپڑے بچھائے ہوئے ربڑ کے جوتے' ڈرائی فروٹ کے ڈھیر' دوسری دنیا کے بنے ہوئے الیکٹرونک گیجٹس' حیران آنکھیں' اجنبی زبان میں گفتگو۔۔

ہر سمت میں ہر عمر کے ۱۹۹ افراد سینوں پر آئس کریم کے سگز' ہاتھوں میں ٹرے' ہر کار کے اور ہر رکنے والے قدم کے پیچھے۔۔۔

سڑک کے آر پار رسیوں سے معلق سہرے: نشہ لعنت ہے۔۔ بھارتی درندے' کشمیر ہمارا ہے' قومی یک جہتی ہمارا ایمان' رشوت لعنت' ہارن بجانا منع ہے۔۔

چاروں طرف سے ہارنوں کی دلدوز چیخیں' ٹریفک کے سپاہی کے منہ پر ماسک

کانوں کے گرد مفلر۔

ایک دبلا پتلا معمر' جسے پرانے شہریوں نے اسی جگہ پر اسی ٹین کے بنے ہوئے زنگ آلود دھتو کے ساتھ بوڑھا ہوتے دیکھا ہے اور جس کی آواز اب بیٹھ گئی ہے : بے حیاؤ سر پر چادر لو" وہ یہ ورد کرتا ہوا عورتوں کے پیچھے' خوف زدہ عورتیں اور تیز تیز قدم۔

سینہ کوبی' ہائے ہائے' پولیس مردہ باد' کپڑوں پہ لکھا ہے۔ اقلیتوں کا تحفظ' تفتیش میں تشدد' ہائے ہائے' ایک خون آلود لاش ننگی چارپائی پر چاروں شانوں چت۔ آگے پیچھے پولیس کے دستے' جیپیں' واٹر گن۔۔''

ایک سفید زنگ آلود چڑی مڑی سی کار آہستہ آہستہ چلتی بھیڑ کو کاٹتی ہوئی کاروں کے درمیان جگہ بناتی ہوئی رک گئی ہے۔ کار کے رکتے ہی چاروں طرف سے انسانوں کی یلغار۔ کار کا محاصرہ۔ کار میں دو ادھیڑ عمر کے آدمی۔ جو کار چلا رہا ہے وہ تیزی سے اپنی سیٹ سے اٹھا ہے اور کار کا دروازہ زور سے بھینچ کر بغلی گلی میں گم۔ پچھلی سیٹ پر ایک معمر آدمی سیٹ پر سے اخبار اٹھا کر مطالعے میں مصروف۔ روشنی کی کمی' وہ بار بار اپنی عینک صاف کرتا ہے۔ اسے صاف دکھائی نہیں دیتا' اس نے اخبار کو سیٹ پر دراز کر دیا ہے اور عینک ماتھے پر چڑھالی ہے۔ جیب سے سگرٹ نکال کر اسے روشن کیا ہے۔ وہ اگلی سیٹ سے اٹھ کر پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا ہے۔ اس نے ایک دو مرتبہ گھڑی دیکھی ہے جیسے اس کے ساتھی کو گئے کافی دیر ہو گئی ہے۔

ہجوم میں کبھی حرکت ہوتی ہے تو یہ پانی کی طرح پھیلتا جاتا ہے پھر کچھ دیر کے بعد سکڑ جاتا ہے۔ ہجوم میں زیادہ تعداد مانگنے والوں کی ہے' ان کے علاوہ بے شمار لوگ ہاتھوں میں ازار بند' پنیں اٹھائے ہوئے اس ہجوم میں نئے شامل ہونے والوں کے تعاقب میں ہیں۔ بے شمار لوگ کاندھوں پر قالین اٹھائے ہوئے ہیں'

ہر کوئی کچھ نہ کچھ بیچنے کے لئے بے چین ہے لیکن خریدنے والا کوئی نہیں ہے۔
سکنجبین، لسی، پکوڑے، کھجوریں، باداموں والا دودھ ---۔ سب کچھ فیشن ایبل
سڑک کے ایک گوشے میں بیت رہا ہے۔ بجلی کے کھمبے پر دہشت گردوں کے
خلاف پوسٹر، اس کے پاس دو سپاہی کرسیوں پر خراٹے لے رہے ہیں۔ ادھیڑ عمر کا
آدمی کار سے باہر نکلا ہے، دو تین انگڑائیاں لی ہیں "اوہ مائی گاڈ" کہہ کر پھر کار میں
بیٹھ گیا ہے، اس کی نگاہیں اپنے ساتھی کی متلاشی ہیں۔ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر سر
نیوڑے بیٹھ گیا ہے پھر ایک دم سر اٹھایا جیسے کوئی اسے متوجہ کر رہا ہو۔ کار کے
چاروں دروازوں کے شیشے نیچے ہیں، چاروں دریچوں سے چار چہرے، چاروں
چہرے بیک وقت بولنے لگے ہیں، اس نے گھبرا کر باری باری سب کی طرف دیکھا
ہے لیکن کسی ایک کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ کار سے باہر شور اور
کار کے اندر چار آوازوں نے سب کچھ گڈمڈ کر دیا ہے۔

اس نے کار کے ایک دریچے سے باہر غور سے دیکھا، ایک ادھیڑ عمر عورت
کچھ میلے اور کچھ صاف کپڑوں میں ملبوس، ایک بچہ پیٹ میں، ایک گود میں اور
ایک انگلی سے لگائے چہرے پر غم اور انتہائی کرب کا تاثر، آواز میں لجاجت ---:

"خدا کا واسطہ ہے، میرے بچے صبح سے بھوکے ہیں، میری چار لڑکیاں ہیں، ان
کا کوئی آسرا نہیں ہے۔ میرے خاوند کو فالج ہو گیا ہے وہ کام نہیں کر سکتا، اللہ
تمہیں لڑکا دے، حج کرائے، کچھ تو دو، بولتے کیوں نہیں، نٹے منہ، اللہ تیرا بیڑہ
غرق کرے"۔ اس نے عورت کو سپاٹ نگاہوں سے دیکھ کر منہ کار کے دوسرے
دریچے کی طرف کر لیا ہے جہاں ایک سرخ و سفید چہرہ بمعہ داڑھی اور سر پر
افغانی ٹوپی رکھے اس کا منتظر ہے، دونوں کی نگاہیں چار ہوتی ہیں، وہ اپنی آنکھیں
سکیڑ لیتا ہے، اس کا چہرہ اس کی نگاہوں سے بتدریج معدوم ہوتا جا رہا ہے لیکن
بہت سی آوازوں میں اس کی کھردار آواز اس کی سماعت میں گونج رہی

ہے ---:

"اے بھائی آنکھیں بند کیوں کرتا ہے، مسلمان ہوں، مصیبت میں ہوں، اپنا
ملک کون چھوڑتا ہے، کابل میں بمباری ہو رہی ہے، سب کچھ تباہ برباد ہو گیا ہے،
دو بچے ساتھ ہیں، کچھ مدد کرو، ہم بھکاری نہیں ہے، اپنے ملک میں معزز آدمی
ہوں"۔ اس نے ایک پل کے لئے اپنی آنکھیں کھولی ہیں اسے لگا ہے کہ ایک بہت
بڑا کانپتا ہوا چہرہ کار کے دریچے پر ٹکا ہوا ہے اور اس کی داڑھی جھاڑی کے جھنڈ
کی طرح لہرا رہی ہے۔ وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے پیچھے ہٹ کر سکڑنے لگا ہے۔ وہ
لپک کر اپنی سیٹ سے اٹھ کر ڈرائیور سیٹ پر جھک کر زور زور سے ہارن دینے لگا
ہے۔ کسی نے چھڑی سے اس کی پشت کو ٹھونکا ہے، اس نے اپنی سیٹ پر گرتے
ہوئے دائیں جانب دیکھا ہے جہاں ایک سارجنٹ ہاتھ میں چھڑی لئے اسے کہہ
رہا ہے: مسٹر یہاں ہارن بجانا منع ہے۔" اس نے جواب میں کار سے باہر چاروں
طرف دیکھا ہے جہاں لوگ شکر قندی کھا رہے ہیں، چلغوزوں کا سر پھوڑ رہے
ہیں، ہاتھوں میں کون آئیس کریم پکڑے فحش مذاق کر رہے ہیں۔ سامنے شاپنگ
پلازا کی سیڑھیوں سے تین فربہ سیاہ فام پستہ قامت عورتیں چیخ چیخ کر باتیں کرتی
گھبرائی ہوئی نگاہوں سے اردگرد کی گرسنہ نگاہوں کو دیکھ رہی ہیں۔ سامنے سیاہ
مرسیڈیز کار میں ایک سفید گداز بازو باہر نکلا ہے جس کی مخروطی انگلیوں میں دس
روپے کا نوٹ کار کے دریچے کے پاس کھڑے لڑکے نے جھپٹ لیا ہے۔ تمام
کاروں کے گرد دریچوں پر لوگ ہی لوگ جھکے ہوئے ہیں۔ اس کار کا ایک دریچہ
خالی دیکھ کر وہی لڑکا دس روپے کا نوٹ اپنی جیب میں اڑستا ہوا سیدھا اس طرف
آیا ہے اور دریچے کے فریم پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر دیکھ رہا ہے جیسے کوئی فریم شدہ
تصویر محو فکر ہو۔ اس کے ہاتھ میں زرد رنگ کا ڈسٹر ہے۔ کچھ دیر گھورنے کے
بعد اس نے اجازت لئے بغیر کار کو صاف کرنا شروع کر دیا ہے۔

ثی ثی" کار میں بیٹھے شخص نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جھٹک کر اسے دور رہنے کا اشارہ کیا ہے لیکن اس کالڑکے پر کوئی اثر نہیں ہوا' لگتا ہے وہ ایسی باتوں کا عادی ہے۔ لڑکا اس کی نیت اور غصہ بھانپ گیا ہے۔ منہ بسورتا' بڑبڑاتا ہوا دائیں ہاتھ میں پکڑے گندے سے ڈسٹر سے آنکھیں ملتا ہوا کار کے دریچے کے پاس آگیا ہے۔

"بڑے صاب' صبح سے کھانا نہیں کھایا' خدا کا واسطہ ہے کچھ دے دو"۔ اسے اپنی التجا کا کوئی مثبت جواب نہیں ملا' صاب میں سکول جاتا ہوں' میرے پاس فیس کے پیسے نہیں ہیں' میں یتیم ہوں' کچھ تو دے دو' پھر کبھی نہیں مانگوں گا' میرے بہن بھائی صبح سے بھوکے ہیں" کچھ دیر تک اس نے جواب کا انتظار کیا ہے' پھر منہ چڑھا کہ فحش اشارے کرتا ہوا ہجوم میں گم ہو گیا ہے۔ کار میں سوار اپنی نشست سے اٹھا ہے اور اگلی سیٹ پر الٹا ہو کر ڈرائیور سیٹ کے ساتھ دریچے کا شیشہ اوپر چڑھانے لگا ہے۔ اب پچھلی سیٹ کے دو شیشے نیچے ہیں' اس نے بائیں جانب کا شیشہ بایاں بازو دراز کر کے اوپر چڑھا دیا ہے۔ دائیں جانب کا شیشہ نیچے ہے وہ اسے اوپر چڑھانے میں ہچکچا رہا ہے کیونکہ موسم گرم ہے اور کار کے تین شیشے بند ہونے کی وجہ سے کار میں حبس بڑھنے لگا ہے۔ وہ سیٹ سے اخبار اٹھا کر اپنے بدن کو ہوا دے رہا ہے۔ کار کا چوتھا شیشہ نیچے دیکھ کر ایک منحنی بزرگ چوڑی دار پاجامہ اور رامپوری ٹوپی پہنے ہوئے آگے بڑھا ہے' اس نے ایک ہاتھ پر پنجسوروں کا بنڈل اٹھایا ہوا ہے اور گلے میں بہت سی ڈی ڈیکیں مہین زنجیروں کے ساتھ آویزاں ہیں' اس کے بازو کے ساتھ سیاہ ڈوریوں میں چاندی یا کسی سفید دھات کے بنے ہوئے بہت سے تعویذ لٹک رہے ہیں---اس نے ہر طرح کے تکلفات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا ہے---

کے تکلفات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا ہے---

"عزیز من پریشان کیوں ہو' یہ مقدس کلام ہے' اس ڈسک کو کار کے شیشے سے آویزاں کر لو' سب حادثات سے نجات' خانگی جھگڑے ہمیشہ کے لئے ختم' ہدیہ صرف بیس روپے..."۔ کار سوار کے چہرے پر پریشانی کے آثار زیادہ گہرے ہو گئے ہیں' اس نے جیب سے بیس روپے نکال کر آدھ کھلے شیشے سے باہر ہاتھ نکالا ہے' رامپوری ٹوپی پہنے بزرگ نے تعویذ شیشے کے اس پار بڑھا دیا ہے۔ کار سوار نے کالی ڈوری والا تعویذ گردن میں ڈال کر شیشہ اوپر چڑھا دیا ہے۔ دور سے اسے اپنے ساتھی کا چہرہ نظر آیا ہے جو ہاتھ میں کار کی چابی گھماتا ہوا کار کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ باہر کا شور اس کے لئے مدھم ہو چکا ہے۔ شاہراہ پر یکے بہ دیگرے دھماکے' پٹاخے' شاہراہ کے وسط میں دھوئیں کے ستون' ڈھولک کی تھاپ' دھوئیں کے اندر سے زرد اور زعفرانی تہہ بند' کرتے اور اکڑے ہوئے صافے' کبھی ایک ٹانگ پر ناچ' کبھی دوسرے پر' چاندی زرق برق' سجی سجائی بڑی سی بگھی' گھوڑے پر گلاب کے ہار' بگھی کے اندر ایک شخص زرق برق شیروانی' سنہری پگڑی پہنے مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہے۔ بگھی کے پیچھے پیدل چلنے والوں کا ہجوم اور ہجوم کے پیچھے کاروں کا سیلاب' ہاں ہی ہارن' ٹریفک کا سپاہی وقوعہ سے غائب' چوراہے میں چوبی ڈبے پر چیتھڑوں میں ملبوس ایک ہجڑا چاروں جانب اپنے بازو اور ہاتھ ہلا کر ٹریفک کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ایک افسانے کی تیاری

☆☆☆ میرا بیٹا ڈاکٹر ہے اور دو سالوں سے بیکار ہے۔

میرے بیٹے کی بیوی بھی ڈاکٹر ہے جو ایک سال سے بیکار ہے۔

وہ پہلے ایک گلی میں چھوٹا سا کلینک چلاتا تھا جو چلتے ہوئے بھی نہیں چلتا تھا۔

اس نے لیڈی ڈاکٹر سے شادی کی تھی کہ دونوں میاں بیوی کلینک چلائیں گے' خوب پیسے کمائیں گے مگر کلینک نہ چلا۔

☆☆☆ انہوں نے اوور ہیڈ اخراجات سے تنگ آ کر کلینک بند کر دیا۔

☆☆☆ ان کی بیکاری میں ایک ایک سال کا اضافہ ہو گیا ہے۔

☆☆☆ محکمہ صحت نے تین سالوں کے بعد صوبے کے دور دراز علاقوں میں صحت کے بنیادی یونٹوں میں کام کرنے کے لئے بیکار ڈاکٹروں کو اچھی تنخواہ کا لالچ دیا ہے۔

☆☆☆ تنخواہ پانچ ہزار' نہ کوٹھا نہ مکان۔

☆☆☆ میاں شمال میں اور بیوی جنوب میں۔

☆☆☆ بڑے شہروں کے ڈاکٹر چھوٹے شہروں میں نہ گئے۔ چھوٹے شہروں کے ڈاکٹر اسمبلیوں کے ممبروں کی مدد سے بڑے شہروں میں آ گئے۔

☆☆☆ میرا بیٹا اور اس کی بیوی میرے ساتھ رہتے ہیں' دونوں کو افسوس ہے

کہ انہوں نے شادی کیوں کی۔

☆☆☆ دونوں ایک دوسرے کو چھوڑنے پر مائل ہیں لیکن کچھ بحث کرنے کے بعد خاموش ہو جاتے ہیں۔

دونوں موقع ملتے ہیں جلا وطن ہونا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے یہاں کی زمین تنگ ہے' اس لئے وہ ایک دوسرے سے تنگ آ چکے ہیں۔

☆

☆☆ میں نے افسانہ شروع کرنے سے پہلے افسانے کا پس منظر بیان کر دیا ہے لیکن پس منظر بیان کرنے سے کہانی افسانے میں منتقل نہیں ہوتی' افسانہ بنانا پڑتا ہے اس لئے میں اپنے آپ کو اس بیان میں شامل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

میں نے اصل میں زندگی بھر کوئی کام نہیں کیا۔ میرے والد نے دو کوٹھیاں وراثت میں چھوڑی تھیں۔ میں نے ایک کوٹھی بیچ کر اس کے پیسے فکسڈ ڈیپازٹ میں جمع کرا دئے ہیں۔

شکر ہے میری اولاد ایک بیٹے تک محدود ہے۔ میری بیوی ایک مدت سے اپنے میکے میں مقیم ہے۔ اس کی ماں اور ایک بھائی ابھی تک زندہ ہیں۔ وہ کھاتے پیتے لوگ ہیں اس لئے انہیں میری ضرورت نہیں ہے۔

میرا بیٹا اور اس کی بیوی کچھ مطلبی قسم کے لوگ ہیں اور میرے فکسڈ ڈپازٹ کو نکھیوں سے دیکھتے ہیں۔ میرا بیٹا مجھے کاہلی اور عمر بھر کوئی کام نہ کرنے کا طعنہ دیتا ہے۔ میں اس کی عف عف کی پرواہ نہیں کرتا۔

میرے بیٹے نے میرا نام اوبلوموف رکھا ہوا ہے۔

میں نے ایک پروفیسر دوست سے اس کا مطلب پوچھا تو وہ بہت ہنسا۔

یہ ایک روسی ناول ہے جس کا کردار اوبلوموف اتنا کاہل ہے کہ عمر بھر اپنی چارپائی سے نہیں اٹھا۔

☆☆ نئی نسل بد تمیز ہے اس لئے مجھے اس کہانی میں شامل نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا ہے اسے فی الحال منسوخ سمجھا جائے۔ سچ بات پوچھیں تو میں افسانہ لکھنے کی مشق کر رہا ہوں کی میرے پاس وقت کاٹنے کے لئے اور کوئی مصروفیت نہیں ہے۔

☆

☆☆ میرا خیال ہے کہ افسانہ لکھنے سے پہلے کردار بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ واقعات کے بیان سے خود بخود ہی کردار بننے لگتے ہیں۔ انہں آزاد رہنے دینا چاہئے۔

☆☆ میں اس فارمولے پر عمل کرتے ہوئے کردار نہیں بناؤں گا۔ اگر کسی نے خود بخود کردار بننے کی کوشش کی تو میں اسے نہیں روکوں گا۔

کیا کرداروں کے بغیر افسانہ لکھا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب اس کو دینا چاہئے جس نے کردار بننے کا فیصلہ کیا ہے۔ بہرکیف اسے آزادی دینی چاہئے۔

☆

☆☆میں نے سنا اور پڑھا ہے کہ کہانی میں ابتدا موثر ہونی چاہیے تاکہ وہ قاری کو یک دم اپنی گرفت میں لے لے۔ بعض اس کی ابتدا منظر نگاری سے کرتے ہیں اور بعض فلسفی بننے کی کوشش میں ادھر ادھر کے عمومی بیانات دینے لگتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہانی میں ابتدا' وسط اور انجام کی تین اکائیوں کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ یہ میرا پہلا افسانہ ہے اس لئے اس میں سب کچھ گڈمڈ ہونے کا احتمال ہے۔ اس لئے آپ اسے جہاں سے چاہیں شروع کر لیں اور جہاں چاہیں ختم کر دیں۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ کہانی اور افسانے میں فرق ہوتا ہے۔

افسانہ ایک سٹرکچر ہوتا ہے جس میں کہانی کی لڑی چلتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ افسانہ آگے بڑھ رہا ہو اور اس کی کہانی کی لڑی ایک جگہ پر رکی ہو۔

میں اس کہانی کو سوچے سمجھے بغیر' کسی قسم کی منصوبہ بندی کے بغیر لکھتا جاؤں گا' دیکھیں یہ افسانہ بنتا ہے یا نہیں۔

دراصل اس کہانی کا راوی میرا بیٹا ہے اور اسے خود یہ کہانی بیان کرنا چاہیے لیکن وہ کھردرا سا پروفیشنل آدمی ہے اسے ایسی مصروفیت سے کوئی دلچسپی نہیں۔

☆☆☆ اس پر پیسے کمانے کی دھن ہے کیونکہ وہ مجھ سے الگ رہنا چاہتا ہے۔

☆

☆☆☆ میرا بیٹا' اس کی بیوی' بیٹی اور اس کا سابقہ ڈسپنسر میری چھوٹی سی کار میں شہر سے ۳۰ میل دور ایک قصبہ چک تمولی کی طرف جا رہے ہیں۔

☆☆☆ کار کی ڈگی میں کچھ بچی کھچی دوائیاں ہیں جو میرے بیٹے نے کلینک بند کرنے کے بعد سنبھال کر رکھی ہیں۔

☆☆☆ کار میں ان کی بچی دونوں کو زچ کر رہی ہے۔

☆☆☆ اقبال ڈسپنسر سیاہ رنگ کا ہنومان سے مشابہ ایک دیہاتی نوجوان ہے جو شہر کے قریب چک تمولی کا رہنے والا ہے اور صبح شام پیسے دوگنے کرنے کے چکر میں رہتا ہے۔۔ اس کہانی کو وقیع بنانے کے لئے اس کی شمولیت ضروری ہے۔

☆☆☆ میرا خیال ہے کہ کہانی کے واقعات اب افسانے کی صورت میں ڈھلنے لگے ہیں اور اس کے ساتھ غیر ضروری تفصیلات بھی در آنے لگی ہیں جنہیں روکنا ضروری ہے۔

☆☆☆ کچھ بھی ہو اقبال ڈسپنسر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کے بغیر

افسانہ آگے کی طرف سفر نہیں کرے گا۔ وہ اس سارے بیان میں اپنی جگہ خود ہی بنا لے گا۔ اس کے باپ کی تھوڑی سی زمین ہے جس پر اس نے ڈیرہ بنایا ہے۔ ڈیرے سے باہر ٹالی کے ایک درخت کے ساتھ اس نے ایک بورڈ آویزاں کیا ہے:-

ڈاکٹر محمد اقبال

☆☆☆ پی اے ٹو (آگے میرے بیٹے کا نام اور اس کی ڈگریاں درج ہیں۔

☆☆☆ جب وہ میرے بیٹے کے کلینک میں کام کرتا تھا تو اس نے کچھ نسخے یاد کر لئے تھے جن کی مدد سے وہ سارے گاؤں کا علاج کرتا ہے لیکن لوگوں کا اس پر اعتماد اٹھ گیا ہے کیونکہ وہ لالچی ہے اور مریضوں سے پیسے زبردستی چھین لیتا ہے۔ جو پیسے دینے کے قابل نہ ہو اس کی جامہ تلاشی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے کہ وہ غریب کیوں ہے۔

☆☆☆ اقبال ڈسپنسر کے پاس آنا گاؤں کے لوگوں کی مجبوری ہے کیونکہ دور دور تک کوئی ڈسپنسری نہیں ہے۔

☆☆☆ آج صبح ہوتے ہی اس نے مسجد سے یہ اعلان کروا دیا تھا کہ شہر سے ایک بڑا ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر اس کے کہنے پر لوگوں کا علاج کرنے آرہے ہیں۔ تمام مریض دس بجے تک اس کے ڈیرے پر پہنچ جائیں۔

☆☆☆ دس بجے سے پہلے ہی بہت سے مریض اس کے ڈیرے پر جمع ہو گئے ہیں، جو لاچار ہیں انہیں چارپائیوں پر اٹھا کر لایا گیا ہے۔ اقبال عرف بالے کی آنکھوں میں خوشی کی چمک ہے کہ بہت سے مریض جمع ہو گئے ہیں۔ اس نے مریضوں سے پچاس روپے فیس طے کی ہے جبکہ میرے بیٹے کو چالیس روپے فیس معائنہ بتائی ہے۔

☆☆☆ سہ پہر تک میرا بیٹا اور اس کی بیوی مسلسل مریض دیکھتے رہے ہیں۔

میرے بیٹے کے پوچھنے پر ایک دیہاتی نے بتایا ہے کہ پانچ میل دور ایک ڈسپنسری ہے جس میں ایک چوکیدار رہتا ہے جہاں کبھی کوئی ڈاکٹر نہیں آیا۔

☆☆☆ ڈاکٹر صاحب سنا ہے کہ ایک ڈاکٹر کی وہاں ڈیوٹی لگی ہے وہ اپنی تنخواہ کا کچھ حصہ اوپر دے دیتا ہے اور آپ کبھی نہیں آیا۔

☆☆☆ Very good میرے بیٹے کی بیوی نے دوسرے کمرے سے آواز لگائی ہے۔ تم بھی کوئی ایسا ہیلتھ یونٹ ڈھونڈ لو، مفت کی تنخواہ مل جائے گی۔

☆☆☆ میرے بیٹے نے اس بات یا اس طعنے کا جواب نہیں دیا کیونکہ وہ بڑے انہماک سے مریض کا معائنہ کر رہا ہے۔

☆☆☆ بس بھئی بہت وقت ہو گیا ہے میں اور مریض نہیں دیکھوں گا، اس نے اچٹی نگاہ سے باہر دیکھا ہے جہاں مریضوں کی تعداد کم ہونے کو نہیں آتی۔ اس نے حساب لگا لیا ہے کہ ایک دن کی کمائی سے دو ہفتے آرام سے گزر جائیں گے۔

☆☆☆ باہر اقبال مریضوں کی جیبوں سے پیسے نکالنے اور ان سے لڑنے جھگڑنے میں معروف ہے۔ اگر کوئی پیسے نہیں دیتا تو اس کی چادر اتار لیتا ہے۔ لوگ اس کی منت سماجت کرتے ہیں کہ فیس بہت زیادہ ہے لیکن اس پر ان کی فریادوں کا کوئی اثر نہیں ہے کیونکہ اس نے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے ہیں۔ وہ مریضوں کو گالیاں بھی دے رہا ہے۔

☆☆☆ میرے پاس ڈلیوری کے دو کیس ہیں یہاں تو کوئی بندوبست نہیں ہے۔ میرے بیٹے کی بیوی نے بلند آواز میں دوسرے کمرے سے کہا ہے۔ میرے بیٹے نے بات ان سنی کر دی ہے۔ اتنے میں اقبال عرف بالا میرے بیٹے کے پاس گھبرایا ہوا آیا ہے۔

☆☆☆ ڈاکٹر صاحب، بڑے چوہدری صاحب نے آپ کو بلایا ہے ان کی ماں بیمار ہے۔

☆☆☆ کہہ دو اس وقت میرے پاس بہت سے مریض ہیں میں ابھی نہیں آ سکتا۔

☆☆☆ڈاکٹر صاحب آپ کمال کرتے ہیں" یہ کہہ کر اس نے میرے بیٹے کے گھٹنے پکڑ لئے ہیں" بہت بڑا زمیندار ہے آپ نہ گئے تو میرے سارے خاندان کو کولہو میں ڈال دے گا" یہ کہہ کر اس نے میرے بیٹے کا میڈیکل باکس اٹھالیا ہے۔

☆☆☆ آپ کی والدہ کی شوگر بہت بڑی ہوئی ہے" میرے بیٹے نے اپنا گلکو میٹر بند کرتے ہوئے کہا ہے اور ایک دوا لکھ کر زمیندار کو دے دی ہے جس کی عمر پچاس برس کے قریب ہے۔ اس کی چار پانچ کنال کی کوٹھی ہے جس کی دیہاتی انداز میں زیبائش کی گئی ہے۔ اس نے ایک سو روپے کا نوٹ میرے بیٹے کو بطور فیس دیا ہے جو اس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنی جیب میں ڈال لیا ہے۔

☆☆☆چوہدری صاحب آپ کے علاقے کے لوگوں کی حالت بہت خراب ہے' کسی کا دل بڑھا ہوا ہے' اکثر کو ٹی بی ہے اور نہ جانے کیا کیا کچھ ہے۔ یہاں دور دور تک کوئی طبی سہولت نہیں ہے۔ آپ ہی کچھ کریں' یہ گاؤں والے آپ کے بچے ہیں۔

☆☆☆ زمیندار بڑا شاطر ہے"۔ یہ دراصل حکومت کی ذمہ داری ہے' میں بھی تو اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں" یہ کہہ کر وہ اپنا کھسہ پہننے لگا ہے۔اس نے ڈرائیور کو کار نکالنے کے لئے کہا ہے۔

☆☆☆ڈاکٹر صاحب آپ جوان آدمی ہیں۔ آہستہ آہستہ آپ کو ایسی باتیں سننے کی عادت ہو جائے گی۔۔ میں شہر میں اپنی دوسری بیوی کے ساتھ رہتا ہوں' پہلی بیوی والدہ کے ساتھ اسی حویلی میں رہتی ہے۔ ہم دیہاتی لوگ چھوٹی موٹی بیماریوں کی پرواہ نہیں کرتے' خود ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆اقبال عرف بالے نے میڈیکل باکس اٹھالیا ہے۔" باسٹرڈ" میرے بیٹے

نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے زیر لب کہا ہے۔

☆☆☆ میرا بیٹا پھر چھوٹے سے کمرے میں مریض دیکھنے میں مصروف ہو گیا ہے۔ ملحقہ کمرے میں اس کی بیوی مریض عورتوں کا معائنہ کر رہی ہے جہاں دو عورتیں دردِ زہ سے کراہ رہی ہیں۔

☆☆میرے بیٹے پر تھکن اور جھنجھلاہٹ ظاہر ہونے لگی ہے۔" آزاد کر دو انہیں" میرے بیٹے نے چیخ کر اپنی بیوی سے کہا ہے۔

☆☆☆کیسے کر دوں؟ نہ ڈلوری روم ہے اور نہ کوئی دوائی' دستانیں تک بھی نہیں ہیں۔۔ خوامخواہ مجھے یہاں پیسے کے چکر میں لے آئے ہو۔

☆☆☆ باہر ان دو حاملہ عورتوں کی ساسیں لڑکوں کی پیدائش کا مطالبہ کر رہی ہیں۔

☆☆☆ اوپر نیچے تین پوتیاں ہوئی ہیں' اب لڑکی ہوئی تو میں فضلو کے لئے اور لگائی لے آؤں گی۔

☆☆☆ دونوں حاملہ عورتیں میرے بیٹے کی بیوی کے سامنے تھر تھر کانپ رہی ہیں۔ ان میں سے ایک نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ہے۔

☆☆☆ڈاکٹرنی لڑکا کیسے پیدا ہوتا ہے؟

☆☆جس طرح لڑکی پیدا ہوتی ہے لیکن لڑکا اور لڑکی دونوں مرد پیدا کرتے ہیں" میرے بیٹے کی بیوی نے ایک مریضہ کہ شلوار کے اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولتے ہوئے جواب دیا ہے۔ اسے جیسے ایک دم کچھ یاد آیا ہے اور ایک شرارہ اس کی نگاہوں کے سامنے فضا کو کاٹ کر نکل گیا ہے۔ جب الٹرا ساونڈ کی مشین نے اسے بتایا تھا کہ اس کے پیٹ میں لڑکی ہے تو وہ چیخ چیخ کر روئی تھی۔

☆☆☆ باہر ایک عورت کی چیخ بلند ہوئی ہے۔ میرا بیٹا اور اس کی بیوی گھبرا کر بیک وقت باہر نکلے ہیں۔

☆☆☆ چار آدمی ایک حاملہ عورت کو چارپائی پر میت کی طرح اٹھائے ہوئے ہیں جو درد کی شدت سے بلبلا رہی ہے' ان کے ساتھ گاؤں کی کچھ عورتیں بھی ہیں۔

☆☆☆ اقبال عرف بالا ایک چیتے کی تیزی سے اچھل کر اپنی کرسی سے اٹھا ہے اور اس عورت کے خاوند کے بارے میں پوچھا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر لاغر سا دیہاتی آگے بڑھا ہے۔

اوئے اچو یہ تیری لگائی ہے' بڑی تکلیف میں ہے' دو سو روپے نکال ابھی اس کا درد ٹھیک کروا دیتے ہیں۔

☆☆☆ بالے میرے پاس پچاس روپے ہیں' اس نے منمنا کر کہا ہے۔

چل پیچھے ہٹ' بچہ نکالنے کے صرف پچاس روپے' تو اسے دائی کے پاس لے جا۔

☆☆☆ وہ کہتی ہے خطرے والی بات ہے۔

☆☆☆ اسی لئے تو میں نے کیس کے دو سو روپے مانگیں ہیں' وہ یہ کہہ کر اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا ہے جس میں سے پچاس روپے کا ایک پرانا سا نوٹ نکلا ہے۔

☆☆☆ واہ شیر کے بچے' بچہ جنانا تھا تو پھر پیسے بھی اکٹھے کرنے تھے' یہ کہہ کر بالا بدمزہ ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا ہے۔ پھر اس نے اس کی غربت کا حل خود ہی ڈھونڈ لیا ہے۔

☆☆☆ سن تیری ٹماٹر کی ایک پیلی کی فصل میری"۔ اس کا جواب کا انتظار کئے بغیر پھر کہنے لگا ہے" تو اسے سہارا دے میں ڈاکٹرنی سے بات کر کے آتا ہوں' وہ مان جائے سہی۔ میری بیوی یہ باتیں سن کر باہر نکلی ہے اور سب کے سامنے مریضہ کا معائنہ کرنے لگی ہے۔

☆☆☆ اس کی فوراً ڈلیوری ہونی چاہئے اس کی جان کو خطرہ ہے"۔

☆☆☆ اس نے اپنی آستینیں چڑھالی ہیں اور ایک دیہاتی لوٹے سے اس کے ہاتھ دھلوانے لگا ہے۔ میرے بیٹے کی بیوی نے غصے سے کہا ہے۔۔۔

☆☆☆ ہونہہ ان کے بچے سب کے سامنے ڈلیوری کر دوں! تم لوگ پیچھے ہٹو' چاروں طرف چارپائیاں کھڑی کر دو اور ان پر چادریں ڈال دو۔ اردگرد میں موجود لوگ کھسیانے ہو کر پیچھے ہٹنے لگے ہیں۔

☆☆☆ ڈاکٹر صاحبہ' آپ بچہ کھینچنے کی کریں میں نے ڈبل فیس طے کر لی ہے۔

☆☆☆ "شٹ اپ" میرے بیٹے کی بیوی نے غصے سے کہا ہے۔

☆☆☆ چارپائیوں کی اوٹ میں وہ ڈلیوری میں مصروف ہے' کچھ دیر بعد بچے کی رونے کی آواز سنائی دی ہے۔ وہ چارپائیوں کی اوٹ سے باہر نکلی ہے اس کے ہاتھ خون آلود ہیں۔

☆☆☆ "لڑکا؟ لڑکی؟" ہجوم میں سے آوازیں اٹھی ہیں۔"

☆☆☆ انسان" میری بیوی نے غصے سے کہا ہے۔ ہجوم خاموش ہو گیا ہے۔ "اس کی آنول کیسے کاٹیں؟" میری بیوی نے میرے بیٹے سے پوچھا ہے۔؟"

☆☆☆ ہجوم میں سے کسی عورت نے کہا ہے" ہرل کے دھوئیں سے۔"

☆☆☆ جاہل کہیں کی" میری بیوی نے ڈانٹ کر کہا ہے۔

☆☆☆ اتنے میں ایک بڑھیا ہجوم کو کاٹتی ہوئی ایک نوزائیدہ بچے کو پرانے سے کپڑے میں لپیٹے ہوئے میرے بیٹے کی بیوی کی طرف بڑھی ہے۔

☆☆☆ "ڈاکٹرنی' میرے پوتے کو سانس نہیں آ رہا ہے' کچھ کر" چھ پوتیوں کے بعد پوتا نلا ہے۔

☆☆☆ "مرنے دو' اگلے سال ایک اور پیدا کروا لینا" کسی نے ہجوم میں سے آواز کسی ہے۔

☆☆☆ میرے بیٹے نے جھک کر نومولود کا معائنہ کر کے اپنی بیوی سے کہا ہے۔۔

☆☆☆"اسے Aspiration کی ضرورت ہے۔"

☆☆☆ یہ میں کس طرح کر سکتی ہوں؟"۔

☆☆☆ میرے بیٹے نے نومولود کو چارپائی پر لٹا کر ایک دیہاتی کو کہا ہے کہ وہ جلدی سے بوتل پینے والا نپلا لائے۔

☆☆☆ کچھ دیر کے بعد میرے بیٹے نے یہ نپلا نومولود کے حلق میں اتارا ہے اور اس کی دادی سے کہا ہے کہ وہ دوسری طرف سے زور زور سے سانس کھینچے۔

☆☆☆ اس عمل سے بچے کے حلق سے لیس نکلنے لگی ہے اور اس کی چیخیں کسی قدر کم ہوئی ہیں۔

☆☆☆ "مائی گاڈ یہاں سے چند میل دور سب کچھ موجود ہے لیکن..." یہ کہہ کر وہ اپنی کٹ سنبھالنے لگا ہے۔ اس کی بیٹی بان کی چارپائی پر شرارتیں کرنے کے بعد آرام سے ہوئی ہے۔

☆☆☆ اس کو جانے کے لئے تیار ہوتا دیکھ کر بالا تیزی سے اندر آیا ہے۔

☆☆☆ ڈاکٹر صاحب ابھی تو بہت سے مریض باقی ہیں۔

☆☆☆ میں اور مریض نہیں دیکھوں گا۔

٦☆☆☆ بالے کتنی فیسیں جمع ہوئی ہیں؟

☆☆☆ ڈاکٹر صاحب میں نے ابھی گنی نہیں ہیں۔

☆☆☆ "out with money

☆☆☆ اقبال ہنومان کی طرح شکل بناتا ہوا اپنی دونوں جیبوں سے نوٹ نکال رہا ہے۔ میرے بیٹے کی بیوی کو یقین ہے کہ اس نے پیسے کسی اور جگہ بھی چھپائے ہوئے ہیں۔

☆☆☆ بالے کتنے لوگوں سے ادھار کیا ہے؟۔

☆☆☆ بس کوئی چار پانچ" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا ہے۔

☆☆☆ ٹھیک ہے تم ادھار کے پیسے اکٹھے کر کے پرسوں شہر پہنچا دینا۔

☆☆☆ وہ سامنے دیوار کی طرف دیکھ رہا ہے جیسے اس نے یہ بات سنی ہی نہیں۔

☆☆☆ "چلیں" میرے بیٹے نے اپنی بیٹی اٹھا کر کہا ہے۔

☆☆☆ ڈاکٹر صاحب، اگلی اتوار یہاں پر پھر محفل لگے گی۔

☆☆☆ نہیں ہم یہاں اب نہیں آئیں گے۔

☆☆☆ کیوں ڈاکٹر صاحب، اچھی دہاڑی بن گئی ہے۔

☆☆☆ یہاں دوبارہ آنے می کوئی ہرج نہیں ہے" میرے بیٹے کی بیوی نے کہا (میں) ہے، انکار کس بات کا؟۔

☆☆☆ میں ڈاکٹر ہوں، قصائی نہیں ہوں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆ پس نوشت

☆☆☆ میں نے افسانے کی ابتدا میں افسانہ لکھنے کے بہت سارے پینترے بیان کئے تھے، ان میں سے چند ایک کو میں نے استعمال بھی کیا ہے۔ لیکن جب کہانی افسانہ بننے لگی تو سارے پینترے اور ضابطے دھرے کے دھرے رہ گئے اور افسانہ خود بخود ہی بنتا گیا۔

حکایات

ایک ضمنی حکایت

کہتے ہیں کہ ۷ کا ہندسہ پراسرار ہے۔

۷... دنوں میں کائنات تخلیق کی گئی۔

۷... آسمان خلق کیے گئے۔

۷... دروازوں کے پیچھے زندگی اور موت کو اوجھل رکھا گیا۔

۷... سمندروں کا سفر ہر مشکل کا حل ٹھہرایا گیا۔

۷... سروں میں سارے آہنگوں کو قید کیا گیا۔

۷... مقامات نفس سے پرے اصل کو قائم کیا گیا۔

۷... دنوں کا دائرہ کام اور آرام کے لئے کھینچا گیا۔

ہفتہ' اتوار' پیر' منگل' بدھ' جمعرات اور جمعہ شہر زندگی میں داخل ہونے کے ۷ دروازے تعمیر کیے گئے ہیں جہاں وجود اور عدم وجود' شکست اور فتح' انا اور خود فراموشی کی مسلسل جنگ جاری ہے' جو ان دروازوں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے. وہ دوام کا مسافر ہے اور اس کی زندگی ایک تمثیل parable بن جاتی ہے۔

یہ ۷ حکایات ۷ دنوں کا حال ہیں' ایک فرد کے ۷ دن ایک لمحے میں سکڑ کر ایک ناقابل شکست صورت حال بن جاتے ہیں جسے وہ ریزہ ریزہ کر کے باہر نکلنا

چاہتا ہے۔ وہ تمثیل بننے کی بازی ہار جاتا ہے۔ لیکن حقیقت کی بازی جیت جاتا ہے
---- یہ حکایات جزوی طور پر مسلسل ہیں، یہ ایک ہی فرد کے بارے میں ہیں جو
کردار بننے سے انکار کرتے ہوئے اپنے ۷ دنوں کی منفرد حیثیت قائم کرنے پر مصر
ہے، کیونکہ بعض دن متبرک ہوتے ہیں اور بعض منحوس، ہر دن ایک نئی جستجو کا
دن ہے، اس لئے لازم ہے کہ ان حکایات کے بین السطور معانی تلاش نہ کئے
جائیں، ان میں بعید کی بجائے قریب کا قرینہ ہے۔ اس لئے یہ اپنی جسمیت کو
برقرار رکھتی ہیں۔

جو کچھ ہم کر رہے ہیں کیا وہی کچھ ہمیں کرنا ہے؟ جو کچھ ہم ہیں، کیا وہی کچھ ہم
ہیں؟ کیا زمان و مکان کی قید اور انسانی نظاموں میں ہماری ناآسودہ تلملاہٹ کسی
اور حقیقت یا صورت کی تمثیل نہیں ہے؟ تمثیل ۱.۲.۳ اس اعتبار سے ان
حکایات کا تضاد ہیں کیونکہ یہ اپنی جسمیت سے باہر اپنے معانی کا قرینہ مرتب کرتی
ہیں۔

حکایت ۱

حامد مکمل طور پر ماضی کے دائرے میں رہنا چاہتا تھا، وہ جب حال اور
مستقبل کی طرف دیکھتا تو وہ دونوں اپنے منہ ڈھانپ کر اس کی طرف بڑھتے، اس
کے بدن پر جھرجھری طاری ہو جاتی کیونکہ بہت سے مسائل اور امیدیں اس کا
راستہ روک لیتیں، وہ مسائل کو حل کرنے سے معذور اور امید سے خائف تھا
کہ سراب نہ کہیں سے شروع ہوتا ہے اور نہ کہیں ختم ہوتا ہے۔ وہ بظاہر آزاد
تھا لیکن اندر سے بیحد مجبور تھا حامد کی اس الجھن سے نہ تو اس کے بیوی بچے آشنا
تھے اور نہ اس کے دفتر میں اس کے گرد کام کرنے والے۔ وہ ظاہری طور پر
زندگی کی معمولات کو کسی چوں چرا کے بغیر بسر کرتا، جو غبار دل سے اٹھتا اسے
ذہن کے زندان میں پابند رکھتا، جو کچھ ذہن میں بیتتا اسے ماضی کے حوالے کرنے
کی کوشش کرتا کہ وہ ذہنی طور پر فارغ رہے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ دفتر میں کام
کرتے ہوئے اسے کوئی بات یاد آجاتی، وہ جلدی سے اپنی جیبیں ٹٹولتا جیسے کوئی چیز
کہیں بھول آیا ہو، پھر سامنے دیوار پر چسپاں بجتے ہوئے ہندسوں کے کلاک کی
طرف دیکھتا، وقت بہت سست ہے، وہ منہ میں بڑبڑاتا، اس کے گرد کھڑے ہوئے
لوگ اسے حیرت سے دیکھتے، آپس میں سرگوشیاں کرتے، سرگوشیاں آوازوں میں

ڈھل جاتیں وہ گھبرا کر آنکھیں ملتا اور کہتا:جی فرمایئے۔ اردگرد مسکراہٹیں پھیل جاتیں' وہ سر جھٹک کر سیاہی کے کنوئیں میں قلم غرق کرتا اور سفید کاغذ کی سچائی پر جھوٹے دعوؤں سے ایسے نتائج اخذ کرتا جن کے وجود پر خود اسے حیرت ہوتی ۔اس کا کام یہ تھا کہ وہ سچ اور جھوٹ میں،حقیقت یا غیر حقیقت میں فرق قائم کرے' لیکن وہ ذہنی طور پر منتشر رہتا اس لئے اسے سب کچھ جھوٹ لگتا یا سب کچھ سچ۔ ایک دن دفتر میں اس نے ایک درخواست دہندہ کو برملا کہہ دیا:کیوں میرا مغز چاٹتے ہو؟ یہ جھوٹ اور سچ بھی تو انسان نے بنائے ہیں' آج کی سچائی کل کا جھوٹ ہو سکتی ہے اور گزرے کل کا جھوٹ آنے والے کل کا سچ ثابت ہو سکتا ہے نہیں' نہیں' اردگرد سے آوازیں آئیں اور ایک دم اسے اپنی نادانی کا احساس ہوا۔ کمرے میں جب ہجوم کے بادل چھٹ گئے تو وہ اپنی حماقت پر شرمندہ ہوا: مجھے ایسی باتیں برملا نہیں کہنی چاہئیں میں جن کے بارے میں خود واضح نہیں ہوں خواہ مخواہ مغالطہ پیدا ہو جائے گا۔ اس نے دراز سے سفید کاغذ نکالے' ایک کاغذ پر چند حرف لکھے پھر کاغذ پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ اس کا سٹینو گرافر شارٹ ہینڈ کی کاپی تھامے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا رہا۔" تم اپنے کمرے میں جاؤ' میں جو لکھنا چاہتا ہوں وہ لکھوایا نہیں جا سکتا' اور جو کچھ نہیں لکھوانا چاہتا اسے تم خود لکھ سکتے ہو۔" اس نے سگریٹ سلگایا اور ایک نئے کاغذ پر لکھنے لگا۔" مجھے ایک دن کی ہنگامی رخصت ------ ہنگامی؟ ہاں ہنگامی' یہ میرے لئے بہت ضروری ہے۔ مجھے انہماک چاہیئے۔ مجھے کچھ کرنے کے لئے زندہ رہنا ہے' یہ فیصلہ آخر ایک نہ ایک دن تو ہونا ہی ہے' اس لئے ہنگامی رخصت درکار ہے میں نے ہمیشہ ---------- اوہ! ۔ "

حامد اپنی چھٹی کا دن یونہی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ یہ اس سال کی آخری ہنگامی رخصت کا استحقاق تھا۔ اس کے بعد اس کی کمائی ہوئی چھٹیوں کا

ذخیرہ باقی رہ جائے گا۔" میں نے چھٹیوں کے علاوہ اور کمایا بھی کیا ہے؟ ملازمتی حرب میں یہ میرا آخری دفاعی حربہ ہے' پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار کے ساتھ پشت لگا لینا' اپنے آپ کو اپنے اندر سمو لینا' میں کالج کے سوئمنگ پول میں سب کو پریشان کرنے کے لئے پول کی تہہ میں سانس روکے ہوئے چھپا رہتا' سانس ٹوٹتے ہی پھر سطح پر آتا اور سب اطمینان کا سانس لیتے اور کھلکھلا کر ہنستے' مجھے سب قہقہے برے لگتے ہیں' زیر آب اور سطح آب دونوں جگہوں سے خوف آتا ہے' اس خوف سے نجات کے لئے ایک خصوصی انہماک کی ضرورت ہے۔ میں اپنے کمرے کی دیوار پر ایک سیاہ نقطہ لگا کر اسے دو گھنٹے مسلسل سانپ کی طرح آنکھیں جھپکے بغیر دیکھا کروں گا۔ وگرنہ سب کچھ چوپٹ ہو جائے گا۔ یہ ضروری ہے اور بہت ضروری" نزاج موت ہے زندگی نہیں۔ حامد نے ادھر کام شروع کیا۔ ادھر کوئی دوسرا کام یاد آ جاتا وہ اس سے نپٹنے لگا تو پھر خط لکھنے کا خیال آیا۔ سارا دن یونہی بیت گیا اور کمرے میں اس کی کرسی کے پاس الجھے ہوئے دھاگوں کا ڈھیر اونچا ہوتا گیا جیسے سردیوں میں اس کی بیوی پرانے سویٹروں کو ادھیڑ ادھیڑ کر اون کا ڈھیر لگایا کرتی تھی۔

حامد کی ہنگامی رخصت یونہی گزر گئی' سورج کے نیچے ہوتے ہی وہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں کی ریلنگ پکڑ کر اوپر چڑھتا ہوا اپنے کمرے میں جا پہنچا' کمرہ اسی طرح تھا جیسے وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ نارمیلیسی یہی ہے کہ میں نیچے جا کر بیوی بچوں کے ساتھ مل کر رسم زندگی ادا کروں اُن کے ساتھ جھوٹے وعدے کروں۔ نہ ہنستے ہوئے بھی ہنسنے کا بہانہ کروں۔ اور یہ دن یونہی گزر گیا ہے شاید اگلا دن بھی یونہی گزر جائے گا۔ دن ہفتوں' مہینوں اور سالوں میں بدل جائیں گے اور پھر میں خاشاک کی صورت میں دربدر پھرتا رہوں گا۔ "

باہر بے موقعہ اور بے موسم بارش تھی' بارش کا جب پہلا قطرہ اس کے

کمرے کے ٹین کے سائبان پر گرا تو اسے یوں لگا کہ بہت اونچائی سے پانی کی ایک بوند اس کے ماتھے پر گری ہے اور وہ تکلیف سے بلبلا رہا ہے۔ بارش کی پھوار تیز تھی اور ٹین کے سائبانوں پر شور بڑھتا جاتا۔ اس نے روئی کے دو گولے بنائے اور کانوں میں ٹھونس لئے' شور مدھم ہو چکا تھا۔ اس نے الماری میں رکھی ہوئی گرد آلود سکاچ کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا: یہ بھی لایعنی ہے' اس نے سکاچ کا ایک گھونٹ پی کر بوتل واپس الماری میں رکھ دی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے کانوں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ اس نے کمرے میں حبس سے بچنے کے لئے تیسری منزل پر اٹکے ہوئے اپنے حجرہ نما کمرے کی پرانی دیمک خوردہ پھولی ہوئی کھڑکی کا پٹ اپنی طرف کھینچا جو چرچراتا ہوا کھل گیا' بارش تھم چکی تھی۔ باہر کالے آسمان کا کنواں الٹا لٹک رہا تھا۔ اس نے اپنی انگلی کا قلم آفاقی سیاہی میں ڈبو کر ہوا کے مسطر پر کچھ لکھنا چاہا لیکن یہ سوچتے ہی اس کی انگلی پھسل گئی۔ "ہوا ایک کتب خانہ ہے جہاں سب کے اعمال محفوظ ہیں لیکن میں اس کتب خانے میں کیسے اضافہ کر سکتا ہوں؟ میں زندہ ہوں اور اپنے وجود کے اعمال نامہ کو کسی کتب خانے میں محفوظ نہیں کروں گا۔" وہ کھڑکی میں سے پیشاب کرنے لگا۔ "یہ شہر پر میری بارش ہے۔ یہاں کا آسمان خوشگوار نہیں ہے۔ وہاں کا آسمان برہنہ سینے کی طرح کشادہ تھا۔ سمندر کی سرسراہٹ کا دائمی نغمہ' تیز چلتی ہوا' سفاک جلاد کی طرح زمین کے سینے پر کوڑے برساتی ہوئی نکل جاتی تھی اور ستاروں کے عجائب گھر میں وہی کچھ تھا جس کو میں نے ہر عجائب گھر میں تلاش کیا تھا۔ میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھا اتنا کہ میرا پیٹ پھول جائے لیکن جب سے یہاں واپس آیا ہوں ہر ایک خواہش معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ کیا میں نے ہنگامی رخصت اس لئے لی تھی؟ نہیں مجھے تمام زمانوں کو بھول جانا چاہئے اور زمانوں کے احساس سے باہر رہ کر اپنے مسائل طے کرنے چاہئیں۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی مسئلہ زمانے سے یا مجھ سے باہر ہو؟۔"

صبح ہونے کو تھی اور اس کے دل میں ایک نئے ارادے کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کی سلیٹ پر گزشتہ تمام تاریخوں کو ایک ہی جھٹکے سے اس طرح صاف کیا جیسے کوئی بچہ غلط سوال نکالنے کے بعد جلدی سے اسے اسفنج سے مٹاتا ہے۔ وہ خوش تھا کہ اسے اب وہ کھویا ہوا انہماک مل جائے گا جو اسے دوسروں کی زندگی میں دکھائی دیتا تھا۔ اس کے فیصلے کا ایک حصہ مکمل احتیاط تھا کہ وہ کسی کو اپنی قلب ماہیت کا سراغ نہیں دے گا۔ اس کا کوئی دوست نہیں تھا پھر بھی اسے یہ مکمل خدشہ لاحق تھا کہ کسی کو اس تبدیلی کا علم نہ ہو جائے۔ جب بھی کبھی وہ تنہائی محسوس کرتا اپنے خیالوں کو بلا کر ان سے گفتگو کر لیتا۔ دفتر میں بھی وہ لوگوں سے دو حرفی بات کرتا اور پھر ایک دم اپنے اور ان کے درمیان دھوئیں کی چادر کھڑی کر لیتا۔ گھر میں اس کا رویہ ابھی کچھ مبہم نوعیت کا تھا۔ دفتر سے واپس آ کر کھانا کھاتا۔ بیوی سے رسمی گفتگو کے بعد اپنے کمرے میں جا کر اسے اندر سے مقفل کر لیتا کبھی وہ کوئی کتاب پڑھتا' کبھی اجنبی ساحلوں پر کھینچی ہوئی تصاویر دیکھتا اور اپنے ساتھ باہر سے لائی ہوئی چیزوں سے کھیلتا رہتا۔ ایک دن دفتر کے ایک رفیق کار نے اسے کم آمیزی کا طعنہ دیا تو اس نے غصے میں جواب دیا' میں تمہاری یا کسی انسان کی ذات شریف کے بارے میں کچھ نہیں جاننا چاہتا۔"

اگلی صبح ناشتے کی میز پر اس کی بیوی نے کہا: تم نے چھٹی کا دن ایسے ہی ضائع کر دیا ہے۔ رات بھر اپنے کمرے میں کیا کرتے ہو؟ "بس کچھ اپنے دفتر کا کام بقایا تھا۔" کیوں جھوٹ بولتے ہو؟" کیا تم سچ کو برداشت کر سکتی ہو؟" کیا فلسفہ بک رہے ہو۔" میں اپنے ماضی سے ہمبستری کر رہا تھا۔ سن لیا تم نے؟" اور تم کر بھی کیا کر سکتے ہو۔" اس نے گہری نظروں سے بیوی کو دیکھا بریف کیس اٹھایا اور دفتر کی راہ لی

اس کا دفتر ایک بہت بڑی کوٹھی کے مہمان خانے کے ایک کمرے میں تھا۔ اس کے ساتھ دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جس میں اس کے عملے کے ارکان

بوسیدہ فائلوں کے انبار کی طرح اوپر نیچے ٹھنسے ہوئے تھے۔ وہ صبح وقت سے پہلے ہی دفتر میں آگیا تھا۔ وہ ابھی اپنے بریف کیس سے اپنی چیزیں نکالنے ہی نہ پایا تھا کہ ایک ایک کر کے لوگ اس کی میز کے گرد اکٹھے ہونے لگے ' اس نے متحیر لیکن عاجزانہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا کوئی اس کی نگاہوں کی تحریر نہ پڑھ سکا۔ بے شمار ہاتھ کاغذ تھامے ہوئے مضطرب چہروں اور متجسس آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

اس نے دفتر کی میز پر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ سامنے میز پر بکھرے ہوئے کاغذ لفظوں سے خالی ہو رہے تھے۔ اس نے جلدی سے اپنا سر جھٹکا اور اسے اپنا وعدہ یاد آیا۔" ہاں کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟" کمرہ سائلوں سے بھرا ہوا تھا۔ سب کے سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ایک سائل کے ہاتھ میں یو این او کا چھپا ہوا دنیا کا نقشہ تھا وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔" جناب میں اپنے ثبوت میں یہ نقشہ لایا ہوں یہ میری متروکہ جائیداد تھی۔ اس کے عوض "یہ پاگل ہے' یہ پاگل" ہجوم میں سے آوازیں بلند ہوئیں۔" میں پاگل نہیں ہوں" اس نے چیخ کر میز کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔" یہ نقشہ جھوٹا نہیں ہے۔ اگر مجھے کچھ نہیں دیا جا سکتا تو مجھے اپنا آپ دیا جائے۔" اس نے اپنے سٹینو کو بلایا اور اسے لکھانے لگا۔" ان دلائل اور شہادتوں کے پیش نظر ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سائل کا رقبہ متنداویہ پر کوئی استحقاق نہ ہے اور ہم اس کو رقبہ زمین سے ازل تک محروم کرتے ہیں۔ یہ حکم ہماری مہر سے ۱۴ اگست--------۱۴ اگست----------او سٹینو کے بچے بتاؤ ہم کس صدی میں ہیں؟ کون سا سال ہے؟" سٹینو بغلیں جھانکنے لگا۔" سر میں خود بھول گیا ہوں' یہاں مغالطہ ہی مغالطہ ہے" ایک بوڑھے نے اپنی فائل میز پر پٹخ دی کچھ دیر بعد یک دم کمرے میں سناٹا چھا گیا اور کمرے کی درزوں میں چھپے ہوئے جھینگروں کا چھلنی کر دینے والا شور بڑھتا گیا۔ وہ میز پر رکھے ہوئے گلوب کو

گھمانے لگا اور پھر محدب شیشے سے کسی خاص شہر کو تلاش کر رہا تھا' ۱۴ اگست کو میں بھی اپنا استحقاق چھوڑ کر وہاں چلا گیا تھا اور ۱۴ اگست کو ہی وہاں سے واپس آگیا تھا۔ میرا استحقاق--------- میرا استحقاق----------؟ ؎

حکایت ۲

"مجھے ذاتی چار دیواری کی ضرورت ہے جس کے بیچوں بیچ میں اپنے آپ کو قلعہ بند کر سکوں کہ زندگی میرے لئے ایک مسلسل حالت جنگ ہے۔ کبھی اپنے آپ سے اور کبھی دوسروں سے"یوں تو حامد کے پاس اپنے بدن کی چار دیواری موجود تھی جس کے اوپر گنبد سر میں پیوست دو آنکھیں پیہم مراقبت میں رہتیں۔ تاہم دیکھتے دیکھتے بعض دفعہ نظر دھندلا جاتی' وہ واہمے کو سایہ اور سائے کو انسان سمجھنے لگتا: میں کتنا کمزور ہوں میرے پاس نہ اعتقاد کی ڈھال ہے نہ کسی پر اعتماد ہے۔ ہر کوئی بات بات پر مجھے الزام دیتا ہے جبکہ میں کسی کو موردِ الزام نہیں سمجھتا کہ میں خود بری الذمہ نہیں ہوں۔ چلو سب کچھ یونہی بیت جائے گا میں اگلے جنم میں انسان بننے سے انکار کر دوں گا اور التجا کروں گا کہ مجھے ضمیرِ مجرم بنا کر ہر اس بدن میں اتارا جائے جو خود آگاہ اور دوسرے سے غافل ہو" حامد اپنے نئے دفتر کے کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوا کسی نہ آنے والے مہمان کے انتظار میں ایک آہنگ کے ساتھ میز پر پنسل بجا رہا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور انگڑائیاں لیتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اتنی مصروفیت کے بعد ایک دم اتنی فراغت اسے کچھ بھائی لیکن وہ ایک دم چوکنا ہو گیا کیونکہ وہ دفتری مصروفیت اور بعض اوقات ایسے فضول کاموں میں الجھا رہا تھا کہ اپنے وجود سے غافل ہو چکا تھا۔ فراغت سے وہ دل ہی

دل میں بہت خائف تھا کہ فراغت سوچ بن کر وہ سب کچھ مسمار کر سکتی تھی جو کچھ اس نے اپنے اردگرد بیس سالوں میں بعمل مجبوری بنایا ہوا تھا اور جسے وہ اب چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ تاہم وہ گزرے ہوئے دن جو اس کے لئے خنجر کی دھار تھے ایک خوشگوار یادِ رفتہ بن کر اسے سوچنے پر مجبور کر رہے تھے۔ اصل میں حامد کی اتنی خطا نہیں تھی جتنا اسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا تھا۔ صبح ہی سے دفتر سے اس کے کوچ کے بارے افواہیں گرم تھیں۔ اس کا ہر رفیق کار اس کی جگہ لینے کے لئے مضطرب تھا اور بعض اس کی چھپی ہوئی شخصیت کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بھی کر رہے تھے۔ ہر ایک کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ وہ وہ نہیں جو وہ نظر آتا ہے۔ اسے یہ سن کر رنج ہوا کیونکہ دفتری اعتبار سے وہ وہی کچھ تھا جو کچھ وہ تھا اور اس کی شخصیت کے باقی حصے کا تعلق کسی سے نہیں تھا۔ اس دن دوپہر تک اس کا کوئی رفیق کار اس کے ساتھ چائے پینے نہ آیا' وہ بار بار گھنٹی بجاتا لیکن جواب میں کوئی آکر اسے نہ پوچھتا کہ وہ بار بار گھنٹی کیوں بجا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے بارے میں انتہائی قدم نہیں لیا جائے گا کیونکہ اس نے ان میزوں اور کرسیوں کی عبادت کرتے ہوئے اپنا سب کچھ گنوا دیا تھا۔ اپنے آپ کو چمکتے ہوئے دن کی رعنائیوں اور زندگی کی ان لذتوں سے محروم رکھا جو کچھ فاصلے پر اس کے کمرے سے ذرا دور گنجان آباد سڑک پر بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے اس طویل عرصے میں نیک نام کمایا تھا لیکن لوگ اسے سیدھا اور بیوقوف سمجھتے تھے۔ حامد کا یہ طور طریقہ کسی اخلاقی دباؤ کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس کا کام فیصلے کرنا تھا اور وہ ہمیشہ کوشش کرتا کہ متحارب فریقوں میں غیر جانبدار رہے ۔ ۔ یہ مشکل کام تھا کہ اس کی جیبوں میں طرح طرح کے رقعے ہوتے' بار بار ٹیلی فون آتے۔ طرح طرح کی آوازوں اور سرگوشیوں سے اس کی کنپٹیاں جلنے لگتیں۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر کہتا "نہیں نہیں' اکثر یہ ہوتا کہ رات کی تاریکی میں کوئی اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا۔

وہ دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھاتا لیکن پسینے میں شرابور ہو جاتا' دل ڈھول کی طرح بجنے لگتا: انہیں کہہ دو میں گھر میں نہیں ہوں' اس کی بیوی معنی خیز طریقے سے اس کی طرف دیکھتی "تم بزدل ہو" وہ یہ کہہ کر اپنے بستر پر دراز ہو جاتی۔ بدستور دستک کی آواز بڑھتی گھٹتی رہتی اور وہ کروٹیں لیتا ہوا صبح کا منہ دیکھتا۔ "یہ دستک نہیں ترغیب ہے جو مجھے کمزور کرنا چاہتی ہے۔ اس کا فیصلہ میں نے کرنا ہے۔" اس نے زور سے مکہ اپنی میز پر مارا اور چوٹ سے بلبلانے لگا۔

جغرافیے کی کتاب کے مطابق تو زمین سورج کے آگے سے گزر رہی تھی لیکن حامد کو یہ محسوس ہوا کہ سورج تمام کرّوں کو پھلانگتا ہوا اسے تاریکی میں پیچھے دھکیلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ باہر گرمی کی شدت سے ٹریفک غائب ہوتی جا رہی تھی اور درختوں کے سائے بھی اپنے زاویے بدل چکے تھے۔ صبح صبح ہی اس کی بریفنگ کی جا چکی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنے نئے رفقاء کار اور عملے سے دفتری انداز میں رسمی سی ملاقات کی لیکن کسی نے بھی کسی طرح کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اسے کوئی تعجب نہ ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ رزق چھینا جاتا ہے حاصل نہیں کیا جاتا اور ہر کوئی اپنا حق لیتے ہوئے بھی غاصب کہلاتا ہے' ہم سب بے صبر ہیں اور ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ زندگی رشتوں کی اوٹ میں ایک دوسرے کو زیر کرنے' ایک کو دوسرے کا محتاج ثابت کرنے کی مہذب جنگ ہے۔ باہر قدم رکھتے ہی اناؤں کا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ "اوہ کیا انا کو محو کر کے زندگی ممکن ہے؟" ایک دن اس نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا اور پھر اس کے بعد اسے ڈائری لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ "میں تو خود ایک حرف ہوں جسے لفظ بننے کی اجازت نہیں ہے۔ کہیں میں لفظ بن کر معنی کی دنیا میں فساد پیدا نہ کر دوں۔" حامد کبھی کبھی ڈائری لکھتا لیکن وہ بھی اس وقت جب اسے اپنے آپ سے بات کرنا ہوتی۔ یہ اس کے لئے ایک ناقابل فہم صدمہ تھا کہ اسے حیثیت سے

بے حیثیت کر دیا گیا تھا۔ اس کی افادیت کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا' چلو خیر میں فیصلہ وقت کے ہاتھوں چھوڑتا ہوں۔ حامد کا جی چاہا کہ وہ کسی دوست سے اس سارے واقعہ کے بارے میں بات چیت کرے لیکن یہ سوچ کر رک گیا کہ حیثیت سے بے حیثیت اور افادیت سے عدم افادیت میں ڈھل جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اگر اسے کوئی طمع نہیں ہے تو پھر اسے غیر مطمئن نہیں ہونا چاہئے۔ یہ منطق ناقابل تردید ہے لیکن میں نے صرف انکار کا حق استعمال کیا ہے۔ مجھے جو کچھ کرنے کے لئے کہا گیا تھا وہ درست نہیں تھا۔ اس نے ضمناً اس کا ذکر بیوی سے کیا تھا۔ اس نے تنک کر دیکھا اور جواباً بول بلارا شروع کر دیا۔۔ "تم ہٹ دھرم ہو' ہمیشہ اپنی مارے جاتے ہو' لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے۔" اس کی بیوی کا جواب متوقع تھا۔ "تم نے خود اپنے آپ کو بے حیثیت کیا ہے۔ واقعات نے کبھی تمہارا ساتھ دیا ہے جو تم ان کا ساتھ دینا چاہتے ہو؟ اب سارے کام کاج کا بوجھ مجھ پر آ جائے گا۔ باہر کا' اور گھر' میں یہ دو کام نہیں کر سکتی۔" یہ آوازیں کئی مرتبہ اس کے کانوں میں بھنبھناتیں اور غائب ہو جاتیں۔ لیکن وہ ان کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ان سے روبرو ہونا تھا۔ اس میں حوصلہ تھا لیکن دن بدن ہمت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے ایک آدھ مرتبہ ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہا لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو گیا: یہ وقت تیز رفتار ہے یا عمر کا بوجھ' میرا کھیل ختم ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر میری معیاد میں کتنی توسیع کر سکتا ہے؟ میں بے اثر ہو چکا ہوں۔ نہ اپنے کام آ سکتا ہوں اور نہ کسی دوسرے کے اور کیا جواز کے بغیر' کسی خواہش کے بغیر' یونہی انتظار میں زندگی کا چلہ کاٹنا ضروری ہے؟ کیا مجھے ہمیشہ کے لئے ۸ گھنٹے دفتر میں کام کرنا ہے' دوپہر کو بچوں کے ساتھ تاش کھیلنا ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ایک ہی تکرار سننا اور دیکھنا ہے؟" وقت ایک کاہل کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنی رسٹ واچ اور دفتر کے کلاک کا تقابل کیا دونوں میں ہو بہو ایک ہی وقت

تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ اپنے سٹینو کو بلا کر کام کے بارے میں پوچھا۔ اس نے لاتعلقی سے یہی جواب دیا کہ یہاں کبھی کبھی کام ہوتا ہے۔" تو پھر ہمیں کام پیدا کرنا چاہئے۔ اس کا ادھیڑ عمر کا سٹینو عیاری سے مسکرایا۔" سر کام تو وہ پیدا کرتا ہے جو کام کرتا ہے۔" اس نے اس فضول بات کو آگے بڑھانے سے گریز کیا۔ حامد کے لئے یہ فضائی نہیں تھی۔ اس کے بدن کا رواں رواں اپنی اجنبیت سے آشنا تھا کہ دفتروں میں لوگ ایک دوسرے سے تعلق پیدا کرنے کے لئے نہیں آتے۔ کسی کے دکھ درد میں شریک ہونے کے لئے نہیں آتے، ایک خاص ضرورت انہیں لاتی ہے۔ یہ وہ اکھاڑہ ہے جہاں چاپلوسی، منافقت اور ایک دوسرے کو تحقیر کے ذریعے آقا اور غلام کا فاصلہ بتایا جاتا ہے۔

حامد نے اپنی جیب سے ٹیلی فون کی کاپی نکالی اور ایک دو جگہوں پر ٹیلی فون کیا لیکن اسے کوئی نمبر نہ ملا: میں اب اس شہر میں اپنی بنیاد قائم کروں گا۔ چاہے مجھے ہر طرح کا خطرہ ہی کیوں نہ مول لینا پڑے۔ لیکن بنیاد کے لئے تو بہت سے پیسے درکار ہیں جو میں نے اتنی تعداد میں کبھی دیکھے نہیں۔ گذشتہ سال بھی اس نے بیوی کے کہنے پر بے شمار اشتہاروں کا مطالعہ کیا تھا۔ بے شمار لوگوں کو ٹیلی فون کیا تھا لیکن دام سن کر وہ لڑکھڑا گیا تھا۔" اگر یہاں اتنی فراوانی ہے تو یو این او سے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں سیکرٹری جنرل کو اس کے بارے میں تار بھیجنا چاہئے۔" اس کے رفیق کار نے ایک دن باتوں باتوں میں اس کی ہنسی اڑائی تھی: " یار تم بالکل گودے ہو جس زمین کی تمہیں تلاش ہے اس کے اشتہار اخبار میں نہیں چھپتے' آدمی کو کچھ وراثت سے حصہ مل جاتا ہے۔ کچھ خود کما لیتا ہے اور باقی تمہیں پتہ ہی ہے۔: مجھے وراثت میں ایک پریشانی' ایک نراج ملا ہے جسے سمجھ سکوں نہ سمجھا سکوں' اوہ' میرا ذہن پھٹ کیوں نہیں جاتا۔ میرے والدین میرے لئے جواب دہ ہوں اسی طرح جیسے میں اپنی اولاد کے لئے جواب دہ ہوں کہ میں

نے ایک جنم سے بچنے کے لئے دوسرا جنم تعمیر کیا ہے۔ میں دو جہنموں میں جل رہا ہوں۔ ویت نام کے بھکشوں کی طرح جن کی تصاویر نیویارک ٹائمز اور لی ماند میں چھپتی ہیں۔ لیکن میری آگ کے شعلے نظر نہیں آرہے اور لوح وجود ایک ردی کاغذ کے ٹکڑے کی طرح جل رہی ہے اور چار سمتوں سے آتی ہوا اس کے پرزوں کو اس کی راکھ کو دریاؤں اور سمندروں میں پھیلاتی ہوئی ازل اور ابد کا مضحکہ اڑا رہی ہے۔ روکو اسے روکو۔ میری بیوی ڈاکٹروں کی فوج لئے طرح طرح کی سرنجیں اور اوزار لئے میری طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ میری دیوانگی کی قید میں ہے۔ اوہ اسس انسینٹی روکو روکتے کیوں نہیں۔" اس نے میز پر زور سے مکہ مارا۔" تم پاس کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو؟" اُس کا اردلی میز کے ساتھ سہارا لئے ہوئے مسکرا رہا تھا۔" سر میز کا شیشہ ٹوٹ گیا ہے اور آپ کے ہاتھ سے خون نکل رہا ہے۔" اس نے کچھ جواب دینے کی بجائے کرسی پر سے تولیہ اٹھا کر ہاتھ صاف کیا: سنو تم بن بلائے کمرے میں مت آیا کرو۔ مجھے تمہاری پراسرار مسکراہٹ نہیں چاہئے۔" بس سر اُس نے کھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔

اس کی میز پر مسلسل ٹیلی فون بج رہا تھا اور وہ پاس بیٹھا ہوا مسلسل سگرٹ پی رہا تھا۔ لیکن ٹیلی فون کرنے والا بھی صابر تھا آخر تنگ آکر اس نے ریسیور اٹھایا: فرمایئے تم بول رہی ہو۔ کیا ایمرجنسی ہے؟ کیا کہا؟ وہ کون آرہے ہیں۔ تمہارے عزیز جن کے گھر میں ہم ایک سال سے رہ رہے ہیں' ٹھیک ایک ہفتے میں آرہے ہیں۔ نوٹس بہت شارٹ ہے ہم کرائے پر مکان لے لیں گے۔ تم فکر مت کرو۔ میں دیر سے گھر آؤں گا۔ مائی گڈنس' شہر میں جڑیں مضبوط کرنے سے پہلے ہی اکھڑ رہی ہیں۔ کرائے کا مکان لیکن پیشگی کرایہ خیر ابھی ایک ہفتے کی مہلت ہے۔ ہیلو سلیم میں بول رہا ہوں۔ سناؤ دفتر کیسا چل رہا ہے۔ اچھا یار سنو مجھے رہائش کے لئے تھوڑی سی زمین خریدنی ہے۔ بس کچھ مشکل آن پڑی ہے۔ کتنے

میں مل جائے گی؟ کیا کہا تم؟ شہر میں زمین ختم ہو گئی ہے کیسی فضول بات کر رہے ہو۔ پوری بات تو سنو۔ کیا تم اپنے دفتر کا ریکارڈ دیکھ کر بول رہے ہو؟ زمین تو کبھی ختم نہیں ہو سکتی لیکن تم کہتے ہو شہر میں ایک انچ بھی زمین نہیں ہے۔ اچھا خدا حافظ۔''

ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ حامد نے اپنی کار کا دروازہ بھینچ کر بند کیا۔ جو سڑک سامنے تھی اس نے ادھر سٹیئرنگ کاٹ دیا اور کافی رفتار سے کار چلانے لگا۔ سڑک کے دونوں جانب عمارتیں' اور ٹریفک بھاگ رہی تھی اور زمین اس کے سامنے بچھتی جا رہی تھی۔ ہر طرف گلیاں' محلے' بازار: اگر زمین ختم ہو گئی ہے تو یہ لوگ کس طرح زندہ ہیں؟ یہ سامنے اینٹوں کے بھٹے سے دھواں نکل رہا ہے۔ اس نے نہر پر آکر کار روکی۔ پل سے پرے ایک پٹواری یا نمبردار قسم کا شخص درخت کی چھاؤں کے نیچے چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ وہ کار سے نکل کر باہر آیا: نمبردار صاحب اس نہر سے آگے کیا ہے؟ "جی اس سے آگے؟ اس سے آگے وہی ہے جو اس کے پیچھے ہے۔" حامد اس کے جواب پر کچھ متحیر ہوا۔ "یہ آگے زمین کس کی ہے؟" "اس نہر سے آگے زمین ختم ہو جاتی ہے۔" اس نمبردار قسم کی چیز نے حقے کا گہرا کش کھینچا اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ حامد نے ایک مرتبہ پھر اسے متوجہ کیا: اس نہر سے ادھر کس کی زمین ہے؟ وہ سرخ سرخ ڈیلوں سے اسے دیکھنے لگا۔ "یہ اس کی زمین ہے جو اسے حاصل کرے۔" "لیکن کیسے؟" "صاحب جیسے بھی ممکن ہو' آپ کوئی اور زمین تلاش کریں۔" وہ واپس کار میں آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور سٹیئرنگ کے گرد دونوں بازو حائل کر کے سگرٹ پینے لگا: زمین واقعی ختم ہو گئی ہے۔ سب یہی کہتے ہیں لیکن میری ذاتی چار دیواری؟ نہیں' یہ کہاں بنے گی۔ میں اپنے بدن کی چار دیواری میں بھی پناہ نہیں لے سکوں گا۔ ان کے آنے میں ابھی چھ دن باقی ہیں میں ساتویں دن کسی اور شہر کو آباد کروں گا۔

حکایت ۳

حامد دفتر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے باہر سڑک پر نکل آیا۔ اس کے پاس سوچنے کے لئے کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سامنے سیدھی سڑک تھی جس پر وہ چلنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ یہی سڑک آگے جا کر بہت سی سڑکوں میں گم ہو کر راستہ کھو دیتی تھی۔ ایک دن وہ شہر میں صرف یہ جاننے کے لئے گھومتا رہا کہ کوئی ایسی سڑک تلاش کرے جو ایک جگہ سے یکدم شروع ہو کر کہیں ختم نہ ہو۔ لیکن سب سڑکیں چلتی چلتی ایک دوسرے میں محو ہو جاتیں۔ کافی تگ و دو کے بعد بھی اس کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ شہر کی سب سے بڑی دکان پر گیا: آپ کے پاس شہر کا گائیڈ میپ ہے؟ کیا؟ یہ تو ابھی تک بنا ہی نہیں۔ وہ دکان سے باہر نکل آیا: خوب یہ لوگ گائیڈ میپ کے بغیر ہی رہتے ہیں۔ لیکن یہ تو غیر ملکیوں کے لئے ہوتی ہے۔ میں یہاں کا رہنے والا ہوں اور یہاں کے گلی کوچوں سے آشنا ہوں۔ اس کا اضطراب بڑھتا جاتا۔ کبھی وہ اپنے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر مسکراتا: یہ نہ کہیں سے شروع ہوتی ہیں اور نہ کہیں جا کر دم توڑتی ہیں۔ لیکن ہر ایک کو کہیں نہ کہیں سے شروع ہونا چاہئے۔ اس کے لئے ہاتھ کی لکیروں پر چلنا ممکن نہیں تھا کہ ان کا سفر سیاروں کی گردش کا پابند تھا اور راستے میں طرح طرح کے زائچے حائل تھے۔ بچپن سے ہی وہ حساب میں کمزور تھا اور ۱۰۰ میں سے ۳۳ نمبر لے کر پاس ہوتا۔ زائچوں کا حساب کتاب اس کی بساط سے باہر تھا اور اس نے ایک اور

راستہ اختیار کیا۔ اس نے لفٹ کا سہارا لینا مناسب نہ سمجھا اور شہر کی سب سے
اونچی عمارت پر چڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ اس کے پھیپھڑوں نے پھیلنے سے انکار کر دیا۔
وہ ۹۹۹ سیڑھیاں چڑھ چکا تھا بس ایک سیڑھی رہ گئی تھی لیکن سانس باہر اور دل
وقت سے بھی زیادہ تیز، آنکھوں کے آگے تاریکی کے دھبے۔ اس نے آنکھیں بند
کر کے عمارت کی سب سے آخری منزل کی آخری چھت پر آخری سیڑھی پر سے
پوری طاقت سے چھلانگ لگائی۔ کچھ دیر بعد ہوش آئی تو وہ چھت کے فرش پر
اوندھا گرا ہوا تھا اور سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بحال کرنے
کے لئے سگریٹ سلگایا ایک دو کش لئے جس سے اس کے دل کی دھڑکن اور تیز
ہو گئی اور کان گرمی سے جلنے لگے: مجھے اتنی بلندی پر نہیں جانا چاہئے تھا۔ مجھے
بلندی سے نیچے دیکھتے ہوئے ہمیشہ ڈر آتا ہے۔ زمین مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے، میں
اس سے بھاگتا ہوں۔ اوہ نیچے سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے، چیونٹیاں اور پلاسٹک
کے کھلونے ایک دوسرے کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ مجھے منڈیر کے
زیادہ قریب سے یہ منظر دیکھنا چاہئے، درختوں نے اس سڑک کو اوجھل کر دیا
ہے۔ میرا سر چکرانے لگا ہے۔ دل کی دھڑکن نے پھر اپنا آہنگ بدلا ہے۔ مجھے
یہاں سے پیچھے ہٹ جانا چاہئے، یا ایک دم نیچے ہی نیچے مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ یہ
منڈیر اپنی جگہ سے ہل رہی ہے۔ نیچے گھومنے والی مخلوق گردنیں اونچی کر کے
میری طرف کیوں دیکھ رہی ہے؟ میں انہیں نہیں دیکھ رہا ہوں، میں اس سڑک کی
تلاش میں ہوں جو کہیں سے شروع ہوتی ہے نہ کسی میں مدغم ہوتی ہے۔ پکڑلو۔
لفٹ چیمبر کا مستری چھت پر کودا اور آتے ہی اسے گھسیٹنے لگا۔ اس نے سر جھٹک کر
اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ کیا بات؟ کیا بات ہے؟ مرنے کے
لئے کوئی اور جگہ تلاش کرو۔

حامد دفتر سے باہر کوئی اور جگہ تلاش کرنے نہیں نکلا تھا۔ کمرے مین بیٹھے

بیٹھے طبیعت اکتانے لگی تھی ادھر ادھر ایک دو بے معنی سے ٹیلی فون کئے ایک دو
مرتبہ اپنے سٹینو کو کچھ لکھوانے کے لئے بلوایا اور کچھ لکھائے بغیر اسے واپس بھیج
دیا۔ بیوی کو گھر ٹیلی فون کرنے کے لئے ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن ہاتھ
وہیں رک گیا۔ اس نے جلدی سے اپنے بٹوے سے چھوٹی سی ڈائری نکالی اور
مختلف نمبر زیرِ لب پڑھنے لگا۔ کسی نمبر پر اس کی نظر نہ ٹھہری۔ کمرے سے باہر نکلتے
ہوئے اس نے اپنے چپڑاسی سے کہا۔ 'میں واپس نہیں آؤں گا۔ کوئی پوچھے تو کہہ
دینا کہ میں ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔ وہ دفتر سے باہر سڑک پر کھڑا
مسکرانے لگا۔" ضروری کام یہی ہے کہ میں اس سڑک کا تعاقب کروں جو یک لخت
نظر کے سامنے ابھرتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ کھو جاتی ہے اور پھر کبھی اپنا پتہ نہیں
دیتی۔ مجھے اب وضاحت کی ضرورت نہیں ہے زندگی کا کافی حصہ یونہی گزر گیا
ہے۔ باقی بھی یونہی گزر جائے گا۔ اب جمع تفریق ممکن نہیں ہے جو کچھ ہے اس
کے علاوہ زندگی میں اور کچھ نہیں ہے۔ باقی سب کچھ سوچیں ہیں جو ذہن کے اندر
ہیں باہر نہیں۔" اس نے سڑک پر چلتے ہوئے ایک کنکری کو ٹھوکر سے دور پھینکا۔
گیارہ بج چکے تھے ادھر ادھر لوگ تھے، پاس سے گزرتی موٹروں اور رکشاؤں کے پھٹے
ہوئے سائلینسروں کا دہلا دینے والا شور تھا، اس نے ایک پل کے لئے نظریں اٹھا
کر ادھر ادھر دیکھا یہ عمارتیں پرانی ہونے کے باوجود اس طرح قائم ہیں۔ ان کی
پیشانیاں کائی آلودہ ہیں۔ ان کے بدن پلستر سے عاری ہیں۔ یہ شہر پرانا ہو چکا ہے۔
صرف سرکاری عمارتوں کی تازہ فصل ادھر ادھر نظر آتی ہے۔ وہ بدستور چل رہا
تھا اس نے پیاس بجھانے کے لئے کولڈ ڈرنک پینا چاہی لیکن ایک کھوکھا جہاں وہ
پیاس بجھانا چاہتا تھا، مکھیوں اور تعفن سے بھرا ہوا تھا۔ کھوکھے کا مالک میلی بنیان
پہنے پنڈلیوں تک اونچی دھوتی باندھے زنگ آلود چاقو سے پاؤں کے ناخن کاٹ رہا
تھا۔ اس کی پیاس ماند پڑ گئی۔ لیکن حلق بدستور خشک تھا اور بدن پر پسینے کی لکیریں

اس کے انڈر ویئر کی بیلٹ کو تر کر رہی تھیں۔ ٹریفک تھمنے کا نام نہ لیتی ہے اگر گرمی میں مجھے یونہی سر اٹھا کر بے مقصد پھرنا ہے تو پھر اس سے بہتر دفتر کے کولر کے سامنے غنودگی ہے۔ اس وقت سوچنے کی قوت بھی ماؤف ہو چکی ہے۔ نہ سوچنا نہ ہونا ہے۔ اپنے وجود سے دستبرداری ہے میں اپنا آپ کھو چکا ہوں۔ یہی میرا المیہ ہے' بہتر ہے کہ اپنے آپ کو اپنے اندر اور پھر دونوں کو دفتر کے کمرے میں قید کردوں اور دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہوں: نہ ہونا ہی بہتر ہے۔ اگر پھر بھی کانوں میں شور کی بھنک پڑے تو یہ سمجھوں گا کہ یہ سب کچھ نہیں بدلے گا۔ دونوں دائرے یونہی ایک دوسرے کے پابند رہیں گے۔ ایک اور نسل کی ٹریفک شروع ہو چکی ہوگی۔ میں اس دفتر میں اس کرسی پر بیٹھے بیٹھے زندگی کے تمام رستوں کو خیرباد کہوں گا۔ یہ ایک ماتحت کی کہانی ہوگی۔ مجھے روزانہ اسی سڑک سے اسی دفتر میں آنا ہے۔ وہی کام کرنا ہے جو مجھ سے پہلے بہت سے اہلکار کرتے رہے ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ اسے کہا ہے کہ مجھے کسی اور جگہ بھیجا جائے جہاں میری افادیت ہو' وہ بہت اونچی سنتا ہے میں نے ایک دن چیخ چیخ کر اسے کہا۔ وہ سنتے ہوئے بھی نہ سننے کا بہانہ کرتا ہے۔۔۔ اس نے سگار کا کش لیا۔ تمہاری افادیت کا فیصلہ میں نے خود کرنا ہے۔ تمہاری موجودہ حیثیت تمہاری صورتحال ہے۔" یہ سزا واقعی تکلیف دہ ہے' جو وہ چاہتا ہے وہ میں نہیں کر سکتا۔ جو میں چاہتا ہوں وہ اسے پسند نہیں ہے سورج پوری شدت سے چمک رہا ہے۔ یہ میرا پسینہ کیوں بہنا چاہتا ہے؟ وہ چلتا چلتا چوراہے کے قریب پہنچا اور سگرٹ سلگانے لگا تھا کہ ایک دم دھماکہ ہوا کچھ چیخیں بھی سنائی دیں۔ اس نے جلدی سے ادھر ادھر دیکھا' ایک سائیکل سوار اور کار آپس میں ٹکرا گئے تھے۔ سائیکل سوار کار کے سامنے گرا ہوا تھا اور ادھر ادھر سے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا لیکن قدم وہیں رک گئے' لوگ آپس میں بحث کرنے لگے۔ جب تکرار زیادہ

بڑھی تو اس نے موقع پر پہنچنا ضروری سمجھا۔

میں بائیں ہاتھ سائیکل چلا رہا تھا۔

میں اپنے بائیں ہاتھ کار چلا رہا تھا۔

نہیں تم جھوٹ کہتے ہو' تم دائیں ہاتھ جا رہے تھے۔

تم بکتے ہو میری کار ٹوٹ گئی ہے۔

میرا سر ٹوٹ گیا ہے۔

تم سائیکل سوار ہو قصور تمہارا ہے تم نے دائیں طرف آنے کی کوشش کیوں کی؟ یہ دائیں بائیں کی کیا جھک جھک شروع کی ہے۔ سائیکل سوار کو ہسپتال لے چلو۔ ہر ایک نے کسی نہ کسی ہاتھ چلنا ہے ایک بوڑھے نے ہجوم سے سر نکال کر کہا۔ نہیں بائیں ہاتھ چلنے میں سلامتی ہے وہ دیکھو انگریزی میں کیا لکھا ہوا ہے۔ سارا یورپ اور امریکہ دائیں ہاتھ چلتا ہے۔ اس لئے وہاں زیادہ حادثے ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہجوم دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ایک نے کہا چلو اس سے پوچھتے ہیں جو ڈیوٹی پر کھڑا ہے۔ ہجوم کی ٹکڑیاں اس کی طرف بڑھنے لگیں۔ وہ ایک دکان پر بیٹھا سکنجبین پی رہا تھا۔ دونوں ٹکڑیوں نے ایک زبان ہو کر پوچھا۔ آپ نے یہ حادثہ دیکھا ہے؟ اس نے سکنجبین کا آخری گھونٹ پی کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ بھئی تم نے کچھ دیکھا ہے؟ میری ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے۔ ہمیں دائیں چلنا چاہئے یا بائیں؟ یہ وہ بتا سکتا ہے جس کی ڈیوٹی شروع ہو چکی ہے۔ ہجوم پھر خاموش ہو گیا تھا۔ زخمی کو اسی کار میں لادو اور جلدی ہسپتال لے کر جاؤ۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا زخمی کار میں سوار تھا اور کار کی ڈگی کا منہ کھلا تھا۔ کار کا سائلنسر بے تحاشا دھواں اگل رہا تھا اور اوندھے لیٹے سائیکل کے پہیے گھوم رہے تھے۔ ٹریفک معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ حامد نے سورج کی طرف

دیکھا لیکن آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے سڑک کے آخر تک جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ دفتر میں بیٹھے رہنا ہی بہتر ہے۔ وہ سڑک کے عین وسط میں چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے سے بار بار ہارن بج رہے تھے۔ وہ دائیں طرف چل رہا تھا۔ پھر بھی حادثہ ہو گیا۔ وہ اس کے بائیں طرف اور اپنے دائیں طرف تھا پھر بھی حادثہ ہو گیا اس نے اپنا بایاں بازو زور سے ہلایا پھر دایاں بازو ہلایا۔ ہارن بدستور چیخ رہے تھے نہ دائیں نہ بائیں' حامد بڑبڑاتا ہوا سڑک کے وسط میں چل رہا تھا اور اس کے پیچھے بہت سی کاروں اور رکشاؤں کے ہارن چیخ رہے تھے۔

حکایت ۶

حامد نے دفتر کے کمرے میں آویزاں بجھے ہوئے آئینے میں اپنے عکس کو اشارہ کیا۔ آئینے کے فریم میں جکڑے ہوئے عکس نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

You arenobody,Iamsomebody

نہیں! تم جھوٹے ہو' میں تمہیں ابھی ویران کردوں گا۔ وہ آئینے سے ہٹ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور کنکھیوں سے آئینے کو دیکھنے لگا۔ آئینہ ویران تھا اور اس نے قہقہہ لگایا۔ اس کے قہقہے کی بازگشت آئینے کی طرف سے اس کی جانب بڑھی۔ یہ آواز آئینے کی طرف سے آرہی ہے؟ احمق آئینے بھی کبھی بولتے ہیں' وہ صرف دیکھتے ہیں۔ غالباً ایک صدی سے یہ اس کمرے کی دیوار پر آویزاں ہے' لیکن اس نے کبھی نہیں بتایا کہ مجھ سے پہلے کس کس نے اس میں اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ وہ سب کے سب Nobodies تھے۔ دفتر کا کمرہ خالی تھا۔ ایئر کولر کی گھر گھراہٹ کے حبس میں اضافہ کر رہی تھی۔ ملحقہ ہال کمرے میں اس کا سٹاف مسلسل دنگے فساد میں معروف تھا لیکن اس کا خاموش سٹینو مسلسل کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ "میں نے کل بھی کچھ نہیں لکھایا۔ اب بارہ بج چکے ہیں اور ابھی تک کچھ نہیں لکھا' لکھانے کا فائدہ بھی کیا۔ میری بات کون مانتا ہے۔ اس بدبخت ٹائپ کی ٹک ٹک بند کیوں نہیں ہو جاتی؟ میں رات بھر سو نہیں سکا۔ کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا۔ ہر بات معمول کے مطابق تھی شام کو بیوی بچوں کے ساتھ مارکیٹ جانا' ناشتہ وغیرہ خریدنا واپس آکر کھانا کھانا اور پھر بے کیف ٹیلی ویژن پروگرام

دیکھنا' وہ دونوں کس قسم کی محبت کر رہے تھے؟ ان دونوں میں کوئی رشتہ بھی نہیں تھا اور نہ ہی کسی رشتے کے پیدا ہونے کا امکان تھا۔ عورت اور آدمی میں جب کوئی رشتہ نہ ہو اور اگر صرف آدمی عورت کا رشتہ ہو تو ان کی ملاقات منع ہے۔ They are nobodies اس نے سگریٹ سلگایا اور مسکراتے ہوئے آئینے کی طرف دیکھا جس میں اس کی سگریٹ کا دھواں ہوا میں معلق رسی کی طرح اوپر چڑھ رہا تھا۔ یہ ویران ہے اس کے چاروں گوشوں سے زنگ اور نمی آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ اس کا زوال ہے۔ ایک دن یہ اندھا ہو جائے گا اور کسی کو موجودگی کی شہادت نہیں دے سکے گا۔ نہ گزرے ہوئے زمانے کی اور نہ اس عہد کی جس نے ایسے آئینے بنائے جن میں دیکھتے ہی ایک ہلتی ہوئی لہر کے ساتھ دو چہرے بن جاتے ہیں۔ میری داڑھ میں بہت دنوں سے درد ہے اور میں ڈینٹسٹ کے پاس جانے سے گریز کر رہا ہوں۔ ایک دو کے ساتھ ٹیلی فون پر اپائنٹمنٹ بھی لی ہے لیکن اس وقت کوئی نہ کوئی کام نکل آتا ہے۔" اس نے اپنی زبان سے داڑھ کو ہلایا اور درد میں اضافہ ہو گیا' وہ بے چینی سے پھر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ مجھے انہماک سے کام کرنا چاہئے مجھے آٹھ گھنٹے کام کرنے کا معاوضہ ملتا ہے جو زندگی میں خوشحالی کی خبر دینے کی بجائے موت کے احساس کو قریب لاتا ہے۔ میں نے عمر بھر نیک نیتی سے بے تکان کام کیا ہے' جس کو درست جانا اس کی حفاظت کی ہے۔ میں نے جسم کی مشقت کرایے پر دی تھی اپنے ذہن کو ہرگز رہن نہیں رکھا تھا۔ میرے ساتھیوں نے بیس برسوں میں شداد کی جنت بنالی اور میں ان کی طرف دیکھتا رہا' میں بھی وہ کچھ کر سکتا تھا جو کچھ وہ کر رہے تھے۔ وہ مسرور رہے اور میں ایک رنج کے ساتھ جیتا رہا ہوں۔

اس نے سگرٹ سلگایا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "مجھے سگرٹ پینے سے منع کیا گیا ہے' میرے لئے سب کچھ منع ہے" اس نے گہرا سانس لیا اور دکھتی ہوئی داڑھ کو

دانتوں سے کچلنے لگا' ایک دم تیز درد کا بھالا کسی نے مسوڑے میں پیوست کیا اور اس نے اپنا گلہ ہاتھوں سے دبایا۔ اس نے حبس اور پسینے کی یلغار سے بچنے کے لئے دوسری منزل پر واقع اپنے دفتر کی کھڑکی کھول دی۔ باہر سورج نصف النہار پر تھا اور آسمان کی وسط میں چیلوں کے غول عمودی پرواز سے نیچے شہر کی طرف تیزی سے آ رہے تھے۔ زوال کے لمحات آ پہنچے ہیں۔ عمر کب تک ساتھ دے گی۔ سب سے پہلے داڑھ نے روانگی کا نقارہ بجایا ہے۔ حامد نے انگلی سے دکھتی ہوئی داڑھ کو ہلایا۔ درد کی چبھن تیز ہوتی گئی جو بڑھتی بڑھتی اس کی گردن اور شانوں میں پھیل گئی اور شانوں سے نکلتی ہوئی اس کی پنڈلیوں میں آہستہ آہستہ اترتی جا رہی تھی۔ اس نے ایک دو مرتبہ سر جھٹکا کرسی سے تولیہ اٹھا کر چہرے اور گردن پر پسینے کے بے شمار آبلوں کو صاف کیا' لوہے کی چیسٹ پر رکھے ہوئے کولر سے ٹھنڈے پانی کا گلاس پیا۔ حامد کی طبیعت کچھ بہل گئی' داڑھ کا درد سارے بدن میں کیوں پھیل گیا ہے؟ یہ دل کا عارضہ ہو سکتا ہے؟ نہیں یہ درد تو ایک مدت سے بدن میں موجود ہے لیکن آج کیوں یہ سارے بدن میں اُمڈ آیا ہے؟ مجھے ڈینٹسٹ کے پاس ہر حالت میں جانا چاہئے۔ حامد انگلی سے داڑھ ہلاتا ہوا آئینے کی طرف بڑھا کہ وہ اس کی پوزیشن دیکھے' آئینہ ویران تھا۔ اس نے آئینے میں جھانکا اور مگرمچھ کی طرح منہ کھول کر اپنے دانت دیکھنے لگا۔ ایک دو مرتبہ اس نے جلدی جلدی پلکیں جھپکیں' لیکن اپنا چہرہ نظر نہ آیا۔ یہ کیا بات ہے؟ یہ Some body کہ مر گیا جس کے بغیر "Nobody" نظر نہیں آ رہا۔ دونوں کا ایک وقت ہونا ضروری ہے؟ اس نے دونوں ہتھیلیوں سے آئینہ صاف کیا۔ جس پر سانس' نمی' بادل' دھواں یا کسی قسم کی کوئی رطوبت نہیں تھی۔ آئینہ جوں کا توں رہا۔ یہ آئینہ اندھا ہو چکا ہے۔ میری نظر کا دھوکا نہیں ہے۔ میری نظر درست ہے میں ابھی بازار سے نیا آئینہ منگواتا ہوں۔ اس نے پیچھے ہٹ کر میز

کے پہلو میں لگی ہوئی گھنٹی بجانے کے لئے ہاتھ بڑھایا کہ آئینے میں چہرے نمودار ہونے لگے۔" میرا چہرہ تو ایک ہے اور ایک میں سے اتنے چہرے کیسے نکل رہے ہیں"۔ اس نے غور سے آئینے میں دیکھا۔ جس میں چہروں کا ایک حاشیہ حرکت کر رہا تھا۔" یہ چہرے کیوں بگڑتے جا رہے ہیں۔ انسانی چہرے حیوانی روپ میں۔ یہ میرا مالک ہے لیکن اس کا منہ گلے تک پھٹا ہوا ہے اور اس کی ناک الو جیسی' نہیں' میرا ایک رفیق کار بھیڑیا بنتا جا رہا ہے۔ وہ لومڑی نہیں' نہیں یہ فریب نظر ہے یہ "Nobodies" ہیں"۔ اس نے آئینے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کھلی ہوئی کھڑکی کا پردہ پھڑپھڑا رہا تھا اس نے ایک ایک کر کے ڈرتے ڈرتے اپنی انگلیاں اٹھانی شروع کیں۔ آئینہ شفاف تھا اور اسے اپنا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور منہ کھول کر اپنی دکھتی ہوئی داڑھ کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر کے لئے آئینہ میں پھر لہر سی اٹھی اور اس کا چہرہ ٹیڑھا میڑھا ہو کر آہستہ آہستہ سیدھا ہو گیا۔

حامد ابھی تک اپنے اضطراب کی وجہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ تجزیہ بھی کیا۔ کچھ کچھ سمجھا بھی لیکن کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس نے زندگی سے کوئی غیر معمولی توقعات وابستہ نہیں کی ہوئی تھیں۔ اور نہ ہی کوئی ایسا معرکہ کرنا چاہتا تھا جس سے انسانی تاریخ میں اس کا نام تحریر ہوتا کیونکہ وہ ایک عام آدمی تھا لیکن ایک ایسے سکون یا ایسی مسرت کا متلاشی تھا جس کی شرح وہ خود نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی وضاحت کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لئے دوسروں کا وجود ضروری تھا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا دوسروں کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ وہ اس سے صرف، کام کے لئے ملتے تھے۔ اس کی گرہستی اس سمیت تین افراد پر مشتمل تھی۔ تثلیث تھی جس کا ہر خط دوسرے سے ملتے ملتے رہ گیا تھا۔ اس کے اور اس کے بیٹے کے درمیان فاصلہ تھا۔ دونوں میں نہ صرف عمر کا خط کشیدہ تھا بلکہ دو

زمانے حائل تھے' وہ جو کچھ کہتا اس کا بیٹا اس کی تردید کرتا۔ دیکھو تم ابھی نویں جماعت میں پڑھتے ہو تمہاری عادتیں بے ترتیب ہیں۔ دیر تک ٹیلی ویژن دیکھتے ہو' چھٹی کے دن سوتے رہتے ہو' گھر کے کسی کام میں تمہیں دلچسپی نہیں ہے۔ تمہاری کتابیں اور کپڑے ہر جگہ بکھرے ہوئے ہیں تمہاری زبان تیز ہے' سکول میں تم مہذب اور گھر میں وحشی' میں تمہارے لئے ایک اچھا مستقبل چاہتا ہوں" اس کا بیٹا بے اختیار ہنسنے لگا تھا۔" بابا آپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔
پرانے ہیں آپ اپنے مستقبل کی فکر کریں میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ حامد نے سب کچھ خاموشی سے سن لیا تھا۔ اسے کسی قدر اچنبھا ہوا۔" میں نے کبھی اپنے باپ سے اس طرح بات نہیں کی تھی" حالانکہ باپ کی طرف سے اسے اپنے وجود کے دکھ کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز کسی سہارے اور ترکے کے بغیر کیا تھا۔" کیا میرے بیٹے نے بھی وہی کچھ کرنا ہے جو میں نے کیا ہے؟ کیا معیشی دوران بھی موروثی ہوتا ہے؟ مسرت تجریدی نہیں ہے' مسرت شئے کا حصول ہے اور جو اپنے آپ کو بھی حاصل نہ کر سکے اس سے بڑھ کر اور کیا المیہ ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی مسرت اور المیہ خود بنائے گا۔ میں جابر نہیں ہوں' میں اپنی توسیع نہیں کروں گا۔ اپنے آپ کو اپنے آپ تک محدود رکھوں گا۔ یہ ٹیلی فون کی گھنٹی کیوں بار بار بج رہی ہے؟ مجھے کس نے یاد کیا ہے؟ وہ مجھ سے پوچھے گا کہ دوپہر ہونے کو ہے اور میں نے ابھی تک کوئی کاغذ یا فائل اوپر نہیں بھیجی' ہیلو' ہیلو' اوہ ہو شیلا تم ہو؟ بس ٹھیک ہوں' ابھی کام شروع نہیں ہوا' ہو جائے گا۔ یہ سب کچھ غلط ہے میں کسی کا طرفدار نہیں تھا میں نے غلط اور درست میں ایک مدھم سی لکیر کھینچنے کی کوشش کی تھی' ٹیلی فون کرنے کا شکریہ! اس نے ایک دم ٹیلی فون بند کر دیا اور ایک ہاتھ سے اپنا گلہ دبانے لگا۔ درد کم ہوتے ہی اس نے سگریٹ سلگایا۔ شیلا اس کے افسر کی سیکرٹری تھی جو اس کے چھوٹے موٹے کام کر دیتا یا اپنے

رسوخ سے کروا دیتا' وہ تشکر کے طور پر اس کے بارے میں ہر اطلاع اسے قبل از وقت دے دیتی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس مرتبہ وہ خاموش کیوں رہی؟------------

اس نے کتنی مرتبہ اپنے آپ سے سوال کیا" میں سٹیلا کو کیوں زیر احسان لانا چاہتا ہوں؟ جب کہ میں عام طور پر ہر ایک کے کام سے گریز کرجاتا ہوں" کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو یہی جواب دیا" یہاں ہر کوئی کام لیتا ہے کوئی کسی کا کام نہیں کرتا۔ لیکن سٹیلا تمہیں چھوٹی موٹی اطلاعات کے علاوہ کیا دے سکتی ہے؟" وہ کرسی سے اٹھ کر آئینے میں جھانکنے لگا' ایک شرارت آمیز خفت اس کے لبوں کے گوشوں سے مسکراہٹ بن کر نمودار ہوئی۔ اپنے آپ کو دیکھتے ہی اس کے ماتھے پر تفکر کی لکیریں نمودار ہوئیں اور وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ سٹیلا بے حد بھرے ہوئے بدن عورت کے روپ میں ڈھلتی ہوئی لڑکی تھی جس کے انداز گفتگو میں ایک بلاوا' ایک چھپی چھپی سی رکاوٹ' بدن کی حرکات اور لفظوں کی ادائیگی میں متناسب آہنگ کبھی کبھی اس میں خلجان پیدا کرتا' لیکن جو خود ہی تھم جاتا۔ دفتر' لوگ' عمر' بے وفائی' احساس جرم' تکرار' تنوع کی کمی' میں سب سے نجات چاہتا ہوں۔ لیکن خوف غالب آجاتا ہے۔ یہ میری آزادی عمل میں رکاوٹ ہے۔ Nobodies کی آمریت نے مجھ سے میرا وجود چھین لیا ہے۔ حامد دونوں ہاتھوں سے اپنے بال کھینچتا ہوا کرسی پر آگیا اس کا بدن پسینے سے شرابور تھا اور تنفس میں کسی قدر رکاوٹ تھی۔ حامد کو اپنا چہرہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس میں وہ مانوسیت نہیں ہے جو پہلے تھی' اس کا خوشگوار چہرہ اس کے احساس اور مشاہدے کے بغیر ہی نشانات سے گودا ہوا تھا۔ کئی حسابی زاویے اور قوسیں وقت کی اقلیدس کا ثبوت بن چکی تھیں۔" یہ ایک رات میں ممکن نہیں ہے۔ میں دریا کے ساحل کی طرح اندر سے کٹتا رہا ہوں اور مجھے اس کی خبر نہیں ملی' ہاں

اب میں نے بھی نوٹ کیا ہے کہ مجھے دیکھ کر کوئی لڑکی یا عورت کسی تاثر کا اظہار نہیں کرتی۔ میں بھی Nobody میں تبدیل ہو چکا ہوں۔" داڑھ میں سے پھر درد کا فوارہ چھوٹا اور وہ بلبلا کر واپس اپنی کرسی پر آگرا' میز کی دراز سے اسپنل جینزک نکالی اسے ہتھیلی پر رکھا جس کی نمی سے گولی شورہ خوردہ زمین کی طرح پھول گئی۔ اس نے گولی کو ردی کاغذوں کی ٹوکری میں پھینک دیا اور اپنا گلا دبا کر درد کا مقابلہ کرنے لگا۔ اس نے ڈینٹسٹ کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور کرسی کی پشت پر نیم جان ہو کر بدن پھیلا دیا۔" یہ درد سارے وجود کا ہے جو ماضی کی وراثت ہے اور حال کا وعدہ نہیں کرتا۔"

" آپ کی طبیعت ٹھیک ہے کسی نے اس کا کندھا تھپتھپایا' اس نے نیم جان بکرے کی طرح بمشکل آنکھیں کھولیں اور بند ہوتے اور کھلتے پپوٹوں کی درزوں میں سے جھولتے اور پھیلتے ہوئے چہروں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔" یہ آئینہ کیسے دیوار سے اتر کر میری میز پر آگیا ہے؟ کون ہیں جو مجھ پر حکمران ہونا چاہتے ہیں۔"

" اٹھئے میں آپ کے ادارے کا میڈیکل آفیسر ہوں call کے لئے آیا ہوں۔ آپ کے گھر کا ٹیلی فون نمبر کیا ہے؟ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟"

"میری داڑھ اگ رہی ہے' اس لئے درد ہے"۔ ڈاکٹر نے اس کا منہ کھول کر دانت کا معائنہ کیا۔

"آپ کی عقل داڑھ اگ رہی ہے۔"

"اس عمر میں اب مجھے عقل کی ضرورت نہیں کہ میں اپنی بے علمی سے خوش ہوں۔"

حکایت ۵

حامد کے پیچھے حامد ہے۔
اس کے پیچھے ایک اور حامد ہے۔
ہو سکتا ہے کہ ان کے علاوہ ایک اور حامد بھی ہو جو ان حامدوں کے بارے میں سوچتا ہوں کہ یہ سب ایک دوسرے کا پرتو ہیں یا ان کا سرے سے ہی وجود نہیں ہے اور یہ کسی الجھے ہوئے ذہن کا واہمہ ہیں جو حقیقت سے مفرور ہے' اور اپنے آپ کو دوسروں سے جدا کرنا چاہتا ہے۔۔ کیا دونوں کو یکجا کیا جا سکتا ہے؟ حامد نے سگرٹ کا کش لیا اور کرسی کو کسی قدر پیچھے دھکیل دیا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ کسی نے پیچھے سے اس کے پیچھے چٹکی بجائی' اس نے یک لخت پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں دفتر کی کھڑکی کا پردہ ہوا سے سر پٹک رہا تھا: کس نے سرگوشی میں مجھے کچھ کہا ہے؟ کئی دنوں سے یہ آوازیں مجھے پریشان کر رہی ہیں' باہر سڑک پر بے شمار آوازیں ہیں لیکن یہ سب میں سے اپنا راستہ بناتی ہوئی صرف مجھے ہی کیوں سنائی دیتی ہیں؟ بھاڑ میں جائیں یہ سارے ۔۔۔ مجھے کوئی مخل نہیں کر سکتا۔ میں فیصلے کے وقت سب کو پیچھے دھکیل سکتا ہوں۔ تم نے کبھی فیصلہ نہیں کیا۔ تینوں میں سے کسی ایک حامد نے پھر سرگوشی کی۔ حامد اپنی کرسی سے اٹھا۔ میز کے ساتھ رکھے ہوئے کاغذوں کو کچھ دیر کے لئے الٹ پلٹ کیا' اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے ایک دم رک گیا۔ تعلیم نوکری' شادی۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ کسی

فیصلے کے بغیر ہو گیا؟ حامد نے دروازے کے دونوں پردے زور سے کھینچ دیئے اور الیکٹرک کیتل کے منہ سے دیوانہ وار نکلتی بھاپ دیکھ کر مسکرانے لگا: جن باہر نکل رہا ہے۔ اگر ہر انسانی وجود ایک بوتل ہے تو پھر ہر بوتل کا ایک جن ہونا چاہیے جسے کبھی تو باہر نکلنا ہے لیکن آج کل سب بوتلیں بند ہیں اور جن ان میں قید ہیں' یہ باہر نکلیں تو کہرام مچا دیں گے۔ بدبخت کیتل لگا کر کہیں دفع ہو گیا ہے۔ اس نے بجلی کا سوئچ بند کر دیا اور پھر اپنی گھومنے والی کرسی پر واپس آ گیا۔ یہ کرسی گھوم رہی ہے یا آسمان؟ نہیں' گھومنا تو زمین کی قسمت ہے۔ مجھے مغالطہ ہوا ہے میرا گنبد ذہن گردش میں ہے اور وہ آوازیں بھی جو میری وراثت میں آئی ہیں۔ تمہاری وراثت وجود کا ابہام ہے اور جن میں تم رہتے ہو وہ بدن کو آزادی دے کر سوچ کو یرغمال بناتے ہیں۔ ایک حامد نے اس کو گھومتی ہوئی کرسی روک کر کہا: آج صبح سے ہی سوچ کی یلغار ہے یہ کون ہے جو مجھے پیہم پریشان رکھتا ہے؟ صبح سب کچھ گھر میں حسب معمول تھا۔ بچوں کو ان کے سکول میں چھوڑ کر بیوی کو اس کے کام پر پہنچایا۔ وہ کافی دنوں سے بیمار ہے پھر بھی باہر کا اور گھر کا کام کرتی ہے۔ یہ زندہ رہنے کی شرط ہے۔ یہ کون ہے جو مجھے پیہم پریشان رکھتا ہے؟ تم خود ہی ہو۔ سارے حامد کھلکھلا کر ہنسے اور اسے یہ بے موقع ہنسی کافی بری لگی۔ اس کا اردلی چائے کی پیالی اس کے سامنے میز پر رکھ کر اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ "چائے ٹھنڈی تو نہیں؟ سر میں نے گرم چائے بنائی تھی۔ اس نے دانت کچکچا کر اس کی طرف دیکھا اور ایک ہی گھونٹ میں چائے ختم کر دی۔ اردلی پیالی لے کر باہر نکل گیا۔

اس کا دفتر آٹھ بجے شروع ہوتا تھا لیکن وہ پورے سات بجے اپنے کمرے کی میز پر اپنا بریف کیس رکھتا۔ نیم تاریک کمرے میں ادھر ادھر بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھتا۔ اپنے اردلی کا انتظار کئے بغیر خود ہی میز صاف کرتا اور خاموشی

سے کرسی پر بیٹھ جاتا۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے عملے کو بھی قبل از وقت آنا پڑتا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ وہ ہنستا: لوگ مجھے وقت کا پابند سمجھتے ہیں۔ اور کیا تم وقت کے پابند نہیں ہو؟ کیا تم اس سے باہر نکل سکتے ہو؟ ایک حامد نے کہا' بکواس بند کرو' صبح صبح میرا پیچھا مت کرو میں شروع ہی سے ناشتہ دفتر میں کرتا ہوں۔ ایک بسکٹ' ایک چائے کی پیالی' اس لئے میں جلدی آتا ہوں: شاید تم اپنی بیوی سے گریز چاہتے ہو۔ ایک حامد نے پیچھے سے حامد کو کہا اس نے ناشتہ کر کے سگریٹ سلگایا۔ ایک دو فائلوں پر دستخط کئے۔ اپنے بینک کی کاپی دیکھی جس میں اس کے حساب میں چند روپے تھے۔ اور ابھی مہینے کا پہاڑ جوں کا توں کھڑا تھا' اسے تیس سیڑھیاں چڑھنے کے بعد پھر پہلی سیڑھی پر آنا تھا۔ اس پر چڑھنے اور اترنے کی مجبوری تھی۔ پہلی اور تیسویں سیڑھی کے درمیان اسے کہیں وقفہ نظر نہ آتا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا: جو کچھ میں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے نہیں کرنے دیا گیا۔ جو کچھ میں کر رہا ہوں' وہ میں کرنا نہیں چاہتا۔ کیا میرے علاوہ اور حامد بھی ہیں؟ کونسا حامد ہے جو اختلاف میں ہے؟ کیا یہ تثلیث کبھی ایک نقطے پر ملے گی؟ کیا میں ایک ہی لمحے میں ان تینوں کا چہرہ دیکھ سکتا ہوں؟ حامد نے انگلیاں بجا کر میز پر رکھے ہوئے گلاس پیڈ میں جھک کر دیکھا' جس میں اس کی میز کا لیمپ اور ایک ہی گردن پر تین چہرے پیوست تھے' حامد نے ایک مرتبہ سر جھٹکا۔ میری نظر بھی کمزور ہوتی جا رہی ہے' اس نے میز سے عینک اٹھائی' ٹیشو پیپر سے صاف کی' عینک لگا کر پھر گلاس پیڈ میں جھانکا' تین چہروں پر تین مختلف فریموں کی عینکیں تھیں' اس نے گھبرا کر عینک اتار کر گھنٹی بجائی' بدبخت تم نے صبح کا گلاس پیڈ صاف نہیں کیا۔ سارا دن باہر بنچ پر گپیں لگاتے رہتے ہو" سر' میں نے تو آج گیلے تولیے سے گلاس پیڈ صاف کیا تھا" اس نے جھاڑن اٹھا کر پھر گلاس پیڈ صاف کیا" دیکھو ابھی بھی غلیظ ہے۔ تمہیں اس میں اپنا چہرہ نظر آتا ہے؟" حامد نے اپنے اردلی کو گردن سے

پکڑ کر اس کا چہرہ گلاس پیڈ کی طرف جھکا کر اچٹتی نظر سے دیکھا۔ اس کے اردلی کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ باہر بیٹھو"

حامد نے سگریٹ سلگایا۔ اگر کوئی ملنے آیا تو اس سے کہہ دینا کہ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ اس نے کمرے کی کھڑکی کھول دی باہر چبھتی ہوئی زرد دھوپ تھی۔ کچھ فاصلے پر اسے گدلے ٹوٹے پھوٹے کائی خوردہ مکان' اونچی مینار اور دیمک خوردہ خاکستری قلعہ دکھائی دیا اس کی ایڑیوں میں بجلی کوندی اس قلعہ کے گنبد اور تہہ خانے کتنے ہیبت ناک ہیں' اس نے اپنے تین بھائیوں کو تہہ خانے میں بند کر دیا تھا' کیونکہ وہ شراکت کے دعویدار تھے۔ بھائی بھائی حریف ہوتے ہیں۔ جب سے حامد نے اپنے آبائی مکان کو چھوڑا تھا اس نے اپنے تین بھائیوں کو اس شہر میں رہتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے درمیان سلطنت کا تنازعہ نہیں تھا کورو پانڈوں میں اختلاف تھا' ہابیل اور قابیل میں جھگڑا تھا لیکن ہمارے درمیان کچھ بھی نہیں ہے' پھر بھی ہم ہابیل اور قابیل ہیں' مقصد' خویش پروری' مفت اور دوسرے کی تحقیر سب مرد فسطائی ہوتے ہیں اور تم بھی' ایک حامد نے سرگوشی میں کہا۔ اصل حامد نے غصے میں دانت کچکچائے: میں اصل ہوں اور تم سب میرے زیر ہو' میں فسطائی ہوں' جو تم نہیں ہو' میں قابیل ہوں' زندگی میرا حق ہے۔ میں زندگی میں بے لذتی کا مجرم ہوں۔ یہ سب کچھ جو میرے گرد ہو رہا ہے میں اس میں شریک نہیں ہوں۔ حامد نے گھڑی دیکھی' ابھی صرف دس بجے تھے۔ اس نے مصروفیت کی تلاش میں میز کے دراز کھولے ان میں جھانکا کوئی چیز قابل ذکر نظر نہ آئی۔ اس نے خط لکھنے کا ارادہ کیا لیکن کوئی شخص ذہن میں نہ آیا جسے خط لکھا جائے: تم یونہی تنہا رہو گے کہ تم اپنے لئے اور سب کے لئے بیکار ہو۔ کسی ایک حامد نے کہا: ہاں جو تعلق کرسی سے بنتا ہے اس سے تنہا رہنا بہتر ہے۔ اصل حامد نے تینوں حامدوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے اعلان کیا ظ مجھے ہر مہینے

تیس سیڑھیاں چڑھنی ہیں۔ اور پھر پہلی سیڑھی پر پہنچنا ہے۔ حامد کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ یہ وقت کسی ایئر کنڈیشنڈ ریستوران میں بسر کرتا' دفتر میں بیکار بیٹھنا محال تھا۔ کوئی خاص کام کاج نہیں تھا۔ لیکن وہ دن میں ایک دو مرتبہ ٹیلی فون پر چیختا۔ تمہارے پاس کام بہت کم ہے۔ تمہیں اپنی تنخواہ کا حساب دینا ہے۔ ایک دن اس نے چیخ کر جواب دیا: میں اپنی تنخواہ کا حساب دے سکتا ہوں کہ یہ آتے ہی چلی جاتی ہے۔ لیکن اپنے وجود کا حساب دینے سے قاصر ہوں۔ دوسری طرف سے ٹیلی فون بند ہو گیا تھا۔ اس گفتگو کے بعد وہ کئی دن تک اپنے خلاف کاروائی کا منتظر رہا۔

سورج نصف النہار پر آچکا تھا اور کھلی کھڑکی سے سرایت کرتی ہوئی گرم ہوا سے اس کا چہرہ جلنے لگا تھا۔ اس نے آہستہ سے کھڑکی بند کی' اس کی گھڑی کی تین سوئیاں ایک ہی نقطے پر پل بھر کے لئے ساکت ہوئیں۔ پھر ایک خفیف سے جھٹکے سے آگے پیچھے قدم بدلنے لگیں۔ اس نے الماری کھولی اور دفتری قسم کی کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ یہ سب مجھ سے لاتعلق اور بے تعلق ہیں' مرغبانی' مویشیوں کی افزائش نسل' میری کتاب کہاں ہے؟ پچھلے ہفتے میں نے خریدی تھی' یہ سوچتے ہی وہ اور تیزی سے کتابیں اور پرانی فائلیں اوپر نیچے کرنے لگا' باری باری اپنے اہلکاروں کو بلا بلا کر پوچھتا سبھی نفی میں جواب دے کر واپس ہال کرے میں چلتے جاتے۔ ہو سکتا ہے کوئی مانگ کر لے گیا ہو۔ لیکن وہ کون ہو سکتا ہے؟ میرا لین دین کسی سے نہیں ہے۔ میری کتاب کھو گئی ہے۔ اس کی پرانی سسکتی ہوئی کار کئی ایک جگہ رکی' اس نے کار سٹارٹ کی لیکن سوئچ بند کر دیا۔ تینوں حامد خاموش تھے۔ اصل حامد محتاط تھا کہ دوسرے حامد گھات میں تھے۔ میں ان میں سے کسی کا مشورہ نہیں مانوں گا۔ اس نے پھر کار سٹارٹ کی اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد یک لخت دائیں جانب کار موڑ دی' سامنے سے چڑھتی ہوئی کار

اس سے ٹکراتی ٹکراتی بچی' مخالف سمت کی کار ڈرائیور عورت نے چیخ کر کہا۔ احمق! اس نے ایک دم بریک پر پاؤں مارا' کار کا انجن ایک جھٹکے سے بند ہو گیا۔ اس نے سوئچ آف کر دیا اور آستین سے ماتھے پر پسینے کے آبلے پونچھنے لگا: تم واقعی احمق ہو۔ نہ خود رہنا چاہتے ہو نہ ہمیں زندہ رہنے دیتے ہو' تینوں میں سے کسی ایک حامد نے کار کے سامنے کے آئینے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ حامد نے خاموشی کو ترجیح دی کیونکہ اسے اپنی کھوئی ہوئی کتاب کی تلاش تھی۔

وہ قدیم کتب خانے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ان کو گنتا جاتا۔ تیرہ سیڑھیوں کے بعد قدیم کتب خانے کا ہال ہے: تیرہ کا ہندسہ منحوس ہے۔ ہو سکتا ہے ساری گنتی منحوس ہو دیکھا جائے گا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے کلرک نے مسکرا کر حامد کو سلام کیا' کلرک کافی بوڑھا ہو چکا تھا۔ وہ اسے ایک مدت سے کاؤنٹر کے پیچھے ایک اونچی کرسی پر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ بیس سال پہلے بھی وہ اسی طرح کرسی پر بیٹھا ہوتا اور ایک مردار سی پنسل کے آگے چپٹی ہوئی پیتل کی مہر سے کتابوں پر تاریخ ثبت کرتا۔ صرف اس کی عینک کا شیشہ دبیز ہو چکا تھا: صاحب زمانہ کیسے بدلتا ہے۔ ابھی کل کی بات تھی کہ آپ ایک طالب علم کی طرح آتے تھے اور اب ماشاء اللہ آپ کے بالوں میں سفیدی اتر آئی ہے۔ حامد نے پھیکی سی مسکراہٹ سے اعتراف کیا اور کیٹلاگ کے خانے دیکھنے لگا۔ کافی دیر تک کارڈ الٹ پلٹ کرنے کے باوجود کچھ فیصلہ نہ کر سکا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا قدیم کتب خانے کے ہال میں آگیا۔ ہر جگہ آمنے سامنے کتابوں کی الماریاں رکھی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں دن کی روشنی کو ناکافی سمجھتے ہوئے زرد بلب سلگائے گئے تھے۔ ہال میں چند میزیں اور کرسیاں مختلف گوشوں میں مختلف زاویے بناتی ہوئیں سوگوار تھیں' میزوں اور کرسیوں پر دھول کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا اور ال کا فرش دو نیم تھا کہیں مدھم روشنی تھی اور کہیں تاریکی'

اس نے ایک دو کتابیں الماری سے باہر نکالیں لیکن ان کے شیرازوں میں گھسی ہوئی دیمک ان کے اوراق پر مٹی کی لکیروں کے مختلف ڈیزائن بنا چکی تھی۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ یہ کتب خانہ ویران ہو چکا ہے۔ باہر شاہراہوں پر رونق ہے غالباً بہت دیر سے یہاں کوئی نہیں آیا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی وزیٹر بک دیکھی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے اندر آتے وقت اپنا نام اور وقت درج نہیں کیا۔ اس پر کتاب کے تین سو چونسٹھ صفحات خالی ہیں ہر صفحہ پر تاریخ درج ہے لیکن کسی کا نام تحریر نہیں ہے: یہ کیسے ممکن ہے؟ اس نے دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر دیکھا: بھاڑ میں جائے یہ تاریخیں اور یہ وزیٹرز بک' میں یہاں کیوں چلا آیا ہوں؟ کسی خاص کتاب کی ضرورت نہیں' ہو بھی تو پڑھنے سے کیا فائدہ؟ یہ محض بے جان ورق ہیں۔ زندگی کا سیلاب کتابوں سے باہر ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے یہ سیلاب کتابوں کا نتیجہ ہی ہو۔ یہ کتابیں بوڑھی ہو چکی ہیں۔ ان کی دانش اور نئی زندگی کا تضاد ہیں۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر کتابوں کی الماریوں کے درمیان بل کھاتے ہوئے راستوں پر ٹہلنے لگا: یہ علم کی بھول بھلیاں ہیں کسی کو اس وقت خبر نہیں کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ اور یہاں کیا کرنے آیا ہوں۔ اس وقت سب حامد خاموش ہیں۔ وہ میرے احساس کا سراغ لگانے میں ناکام ہو چکے ہیں انہیں صرف اتنا علم ہے کہ میں اپنے دفتر سے مفرور ہوں' اور کتب خانے کی پُرپیچ بھول بھلیّوں میں بے مقصد گشت کر رہا ہوں: نہیں تم اتنے بے مقصد بھی نہیں ہو تم یہاں جو کچھ سوچنے آئے ہو وہ دفتر میں نہیں سوچ سکتے۔ تم ڈرتے ہو تم اپنے ٹیلی فون پر شک کرتے ہو کہ وہ تمہاری باتیں سن رہا ہے۔ اور حامد کا ماتھا پسینے سے شرابور تھا۔ اس نے رومال نکال کر منہ صاف کیا وہ مجھے تکلیف دے سکتا ہے۔ میں اس کا کیا کر سکتا ہوں؟: تم اس کو ختم کر سکتے ہو' ایک حامد نے سرگوشی کی: ' اتنی کتابوں کی موجودگی میں تمہیں کیا سمجھاؤں۔ دوسرے

حامد کی آواز اسکے کانوں میں بھنبھنائی: پڑھا لکھا ہوں موت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ مجھے آیندہ زندگی کے انکار یا اقرار سے دلچسپی نہیں ہے میں صرف اپنی موجودہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں: تم ایک غلام ہو جو انکار کی جرات نہیں رکھتے۔ یہ زندگی تمہاری سزا ہے۔ تم مسرت اور غم کے درمیان بھٹکتے رہو گے۔ کسی ایک حامد نے بلند آواز میں کہا: اوہ میں ایک جنم سے نکل کر دوسرے میں آگیا ہوں۔ میں کسی کی آواز نہیں سننا چاہتا۔ پہلے ہی بہت شور ہے: تو پھر ایسی زندگی سے کیا فائدہ؟ ایک اور حامد نے سرگوشی کی۔ وہ الماریوں کے درمیان سے نکل کر ایک گول میز کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا: ہاں یہ سب کچھ بے ثمر اور بے لذت ہے: تو پھر کیا زندہ رہنا ضروری ہے؟ تینوں میں سے ایک حامد نے سرگوشی کی؛ تمہارا ہر ایک فعل دوسروں نے پہلے ہی پابند کیا ہوا ہے تم ان سے باہر رہ کر کیسے زندہ رہ سکتے ہو؟ اسے قبول کر دیا--------- حامد نے ایک لمحے کے لئے سوچا: میں کس لئے ایسی شب و روز کی زندگی بسر کر رہا ہوں جو زندگی نہیں صرف معمولات کی پابندی ہے۔ نہ خواہش نہ جذبہ' نفرت ذہنی سکون دے سکتی ہے راستہ نہیں بتا سکتی۔

کسی ایک حامد نے اسے نصیحت کی: تمہیں کسی دوست کے پاس جا کر گپ شپ لگانی چاہئے تھی۔ اس قدیم کتب خانے میں کیوں آئے ہو؟ کاؤنٹر کلرک یہ سمجھتا ہو گا کہ تم اپنے کام سے بھاگے ہوئے ہو: ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' میں نے پناہ لی ہوئی ہے۔ اپنی بے مقصدیت سے ' ان دوسروں سے جو میرا تضاد ہیں۔ لیکن مجھے ان کے ذریعے ہی زندگی تک پہنچنا ہے ورنہ میں ایک جسم ہوں جو جسم سے ماوراء نہیں ہے۔ ایک تصور ہوں جو جسم کی صورت میں لوگوں میں سرگرداں ہے۔ دوسرے حامد خاموش تھے وہ اس کے منتظر تھے کہ وہ کیا کرنے والا ہے؟ حامد کتابوں کی الماریوں کے درمیانی راستوں میں آہستہ آہستہ ٹہلتا جاتا' مٹھیاں

بھینچتا اور کبھی منہ میں بڑبڑاتا دکیا بدن کی مسرت ممکن ہے؟ نہیں اسے ممنوعہ قرار دیا گیا ہے۔

میں اپنی سوچ کے بارے میں سوچ نہیں سکتا۔ کیونکہ تشویش جنم لے گی' میں اپنی مرضی کے مطابق کام نہیں کر سکتا کہ اجازت نہیں ہے۔ میں ایک بند کمرے میں ہوں اور کوئی راستہ نہیں ہے: راستہ کیوں نہیں ہے؟ ایک حامد نے اس کی خود کلامی میں مداخلت کی: تم اپنے آپ پر دسترس حاصل کرنے کے لئے دیوتا بننا چاہتے ہو' یہ ناممکن ہے۔ کسی ایک حامد نے پھر اصرار سے کہا: تم حقیقت نہیں ہو ایک خواب ہو جسے کوئی دیکھ رہا ہے۔ چند لمحوں کے بعد خواب کے ٹوٹتے ہی تم ناپید ہو جاؤ گے: نہیں نہیں حامد نے چیختے ہوئے کہا: مجھے چھو کر دیکھو' میں تمثیل نہیں حقیقت ہوں' میں جس وقت چاہوں بدن کو زندگی سے محروم کر سکتا ہوں۔۔ مجھے کسی سے کوئی محبت نہیں ہے۔ میں نے زندہ رہنے کی ذمہ داری قبول نہیں کی ہے۔ میں زندگی اور موت کے درمیان چلتے ہوئے سسک رہا ہوں کہ میرا وجود میرے لئے المیہ اور دوسروں کے لئے ایک تمسخر ہے' آج شام ٹھیک چار بجے اے دانش بھری کتابو' اے عہد گذشتہ کی شہادتو' تم دیکھنا کہ میں تمہارے درمیان کس طرح اپنے وجود کی شہادت دوں گا' کہ اس کا اثبات عدم سے ہے۔------ میں ضرور آؤں گا۔ اس بوڑھے دفتر کلرک کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ میں اگلی صبح سکڑ کر ایک کتاب بن جاؤں گا جسے کتب خانے کا کلرک دوبارہ شیلف میں رکھ دے گا۔ الماریوں کے درمیان اس نے نیم روشن بھول بھلیوں میں گھڑی دیکھی۔ سورج زوال پر ہے۔ حامد الماریوں کے درمیان سے باہر نکل کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبانے لگا: اگر تم مرنے کے لئے پیدا ہوئے ہو یا اگر موت کے بعد صرف موت ہی ہے پھر زندگی اور موت دونوں لایعنی ہیں۔ اور زندگی بڑی لایعنیت ہے جسے مسرتوں کی تلاش

سے پُر کرو: لیکن مسرتیں تو حق یافتگان کے لئے ہیں۔ ایک حامد نے اس کے فیصلے میں ایک نیا رخنہ پیدا کیا: تمہیں نراج میں رہنا ہے۔ کسی امید کے بغیر کسی اعتقاد کے بغیر' میں ---------- مجھے یہاں پھر چار بجے آنا ہے' میں فیصلہ کر چکا ہوں میں انسانوں سے ویران زندگی کو قبول کر سکتا۔ لیکن انسانوں کو نہیں ---------- حامد اضطراب میں پاس رکھی ہوئی میز پر انگلیاں بجانے لگا۔ ایک گوشے سے اخبار کی سرسراہٹ سنائی دی' اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور لائٹر کی ٹک سے نیم تاریکی میں روشنی کا ایک دائرہ ظاہر ہوا۔ سگریٹ کا دھواں ہوا میں پھیلنے لگا **Smoking is probibited** نیم تاریکی میں ایک نسوانی آواز بلند ہوئی۔ حامد بوکھلاہٹ سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ہال میں ایک نیم تاریک گوشے میں کالے لباس میں ملبوس ایک وجود اپنے منہ کے آگے کتاب پھیلائے ہوئے مطالعے میں مصروف تھا: یہاں کوئی ہے؟ اس وجود نے چہرے کے سامنے سے کتاب ہٹا کر کہا۔ آپ کافی دیر سے مجھے مخل کر رہے ہیں: میرے خیال میں یہاں میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے: حیرت ہے آپ کو نظر نہیں آیا لیکن آپ کون ہیں؟ حامد نے اس کی طرف دیکھا' سیاہ برقعہ میں ملبوس عورت نے منہ کو نقاب میں چھپایا ہوا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں برہنہ تھیں: آپ کون ہیں؟ آپ کون ہیں؟ اس نے پھر کتاب منہ کے آگے کھڑی کر دی اور سرگوشی میں جواب دیا: میں شام کو چار بجے آپ کو بتاؤں گی---------- سارے حامد برف کی طرح سرد ہو چکے تھے۔ اصل حامد نے بڑی مشکل سے چیخ کر کہا: آپ کے پاس میری کھوئی ہوئی کتاب کیسے پہنچ گئی؟ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تیزی سے قدیم کتب خانے سے باہر نکلنے لگا تو کاؤنٹر کلرک نے اسے پکارا': صاحب' صاحب آپ سے' لیکن وہ تیزی سے قدیم کتب خانے کی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اپنی کار کی طرف لپک رہا تھا۔

حکایت ۶

حامد اپنی صورتحال کو مکمل طور پر بدلنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اس نے زندگی میں کئی ایک فیصلے کئے لیکن کوئی فیصلہ انجام کو نہ پہنچ سکا جس سے اس کی زندگی کی بنیادی صورتحال بدل سکتی۔ اس طرح اس نے کوئی منصوبہ بندی بھی نہیں کی تھی جس کے مطابق وہ اپنے تمام عوامل میں کوئی یکجہتی پیدا کرتا۔ وہ زندگی کی رو میں بہتا گیا۔ اس نے ابھی تک کسی واقعہ کو جنم نہیں دیا تھا اور خود بھی ایک واقعہ بننے سے گریز کیا تھا۔ اس طرح اس کی زندگی کے چالیس سال بیت گئے اور اسے سوچنے کی مہلت نہ ملی۔ ملتی بھی کیسے؟ میرے گرد مجھ جیسوں نے ہی حصار بندی کی ہوئی ہے۔ میرے نفس کا دارومدار معیشت پر ہے اور میری معیشت میرے اور ان کے درمیان ایک لکیر ہے۔ وہ کود کر اس کے اندر آ سکتے ہیں نہ میں باہر نکل سکتا ہوں اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے میں اس سے غافل نہیں ہوں۔ ابھی تک اگر مجھے یاد ہے میں نے جو انتخاب کیا وہ ایک مجبوری تھی۔ میں اس دنیا میں اپنی مرضی سے نہیں آیا۔ نہ ہی میں اپنی مرضی سے اسے الوداع کہوں گا۔ مجھے دوسروں کی موجودگی اپنے ساتھ بہاتی گئی' میں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ میں کون ہوں؟ ایک منصوبہ ہوں' لیکن ---------- میں اپنے آپ سے چھٹکارا چاہتا ہوں لیکن مجھے ایک شئے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

حامد نے اپنی یہ سوچ ڈائری میں منتقل کی اور رک گیا۔ لمحہ بھر کے لئے پین

دانتوں میں دبایا اور پھر یک لخت اپنے لکھے ہوئے پر سیاہی پھیرنے لگا۔ اس کے اپنے حساب کتاب کے مطابق یہ اس کا اس دفتر میں بلکہ کسی ایک دفتر میں آخری دن تھا۔ کچھ کچھ وقفے کے بعد جب اس کا اسسٹنٹ ڈاک لاتا تو وہ بڑے انہماک سے کاغذات کو جلدی جلدی اوپر نیچے کرتا اور متوقع خاکی لفافہ تلاش کرتا۔ دوپہر کے بارہ بج چکے تھے۔ اور اس کے بعد ڈاک نہیں آتی تھی۔ وہ تمام خاکی لفافوں سے ڈرتا رہا کیونکہ جب بھی کسی خاکی لفافے پر اپنا نام اور عہدہ درج پاتا اس کی روح لرز جاتی۔ دور دراز علاقوں میں تبادلے'۔ کام میں سست روی اور بعض اوقات الٹی سیدھی اور غیر ذمہ دار گفتگو پر تنبیہ کے احکام کئی مرتبہ اسے مل چکے تھے۔ آج وہ خاکی لفافے کے انتظار میں تھا کیونکہ اس نے کل زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے حق کا اعلان کیا تھا۔ بس اب نہیں! کیونکہ اب سب کچھ میری برداشت سے باہر تھا۔ میرے اندر ایک ایسا نزاع ہے جس کا کوئی حل نہیں ہے۔ ایک مایوسی ہے' میں مرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مر نہیں سکتا۔ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن کچھ کر نہیں سکا۔ میں موت سے زیادہ زندگی سے خائف ہوں' زندگی کا خطرہ بے پایاں ہے اور موت میرے لئے امید ہے۔ مایوسی زندگی اور موت کے درمیان ایک خلاء ہے۔ وہ سب جو میرے اردگرد ہیں یہ نہ جانتے ہوئے مسرور ہیں کہ ان کے قہقہوں میں مایوسی کی دل دوز گونج ہے۔ میں اب احمقوں کی طرح بے اختیار زندگی بسر نہیں کروں گا۔ اپنی نیند سوؤں گا اور اپنی خواہشیں لے کر اٹھوں گا۔ جدھر منہ اٹھاؤں گا نکل جاؤں گا۔ میں اب اپنے بدن' اپنے ذہن کا یرغمال ان سے غیر مشروط واپس لے لوں گا۔ کیونکہ نہ مجھے جینے دیا گیا نہ مرنے۔ میں جیتا کیسے؟ میرا باپ ایک کلرک تھا۔ میں اپنی وراثت سے خائف تھا۔ میں نے اپنے باپ کو معمولی افسروں کے سامنے کانپتے لرزتے اور ہتک برداشت کرتے دیکھا۔ میں نے کہا: نہیں ابا میں بدلہ لوں گا۔ ان سے نہ سہی جنہوں نے تمہیں

ذلیل کیا' بلکہ ان تمام سے جو ایسا کرتے ہیں۔ لیکن میرے ابا نے کہا: جو قابیل کو قتل کرے گا اس سے سات گنا بدلہ لیا جائے گا۔ میں خاموش ہو گیا تھا۔ میں بدلہ لینے کی خاطر خود بیس سال خوف سے لرزتا رہا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میں مراعتوں کا منتظر تھا بلکہ میں صرف زندہ رہنے کا خواہش مند تھا۔ میں حق یافتہ نہیں تھا۔ لیکن بیس سال کے بعد میں بھی وہی بن گیا جن سے میں بدلہ لینا چاہتا تھا۔

حامد کے دفتر سے باہر رکشاء اور بسیں حسب معمول چیخ وپکار کرتی ہوئی مسافرت میں تھیں' ملحقہ ہال کمرے میں اس کا عملہ بدستور اسی طرح کام میں معروف تھا۔ اس کا اردلی اسی طرح کمرے کے باہر بنچ پر غنودگی کے عالم میں تھا۔ لیکن لحہ بہ لحہ اس کا اضطراب ایک خوف میں ڈھلتا جا رہا تھا۔ جس نے ایک خوف سے آزادی چاہی لیکن ایک دوسرے خوف نے عشق پیچاں کی طرح مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ نہ جانے وہ کیا جواب دیں؟ میں نے کسی خطرے کے پیش نظر یہ سب کچھ لکھ کر دیا ہے۔ میں نے یہ پیش بندی کی ہے' میں نے جواز فراہم کیا ہے۔ لیکن جواز وہ فراہم کرتا ہے جو خطاکار ہو۔ کیوں نہیں میں خطاکار ہوں۔ میں نے اس کمرے سے اندر اور باہر وہی کچھ کیا ہے جسے درست جانا ہے۔ میں نے اس نظام کو بھی قبول کیا ہے جس کی جبریت نے میرا آزادانہ حق انتخاب چھین لیا ہے۔ ہاں' میں نے اس کا ایک غلط کام کرنے سے انکار کر دیا تھا اور پھر اس نے مجھے سزا دی تھی اور اب---------- وقت گزرتا جا رہا ہے۔ مجھے آج جواب ملنا چاہئے ورگرنہ میرے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ حامد اپنی کرسی سے اٹھا اور لوہے کی الماری سے اپنی فائلیں اور کتابیں باہر نکال کر باندھنے لگا۔

یار کیا کر رہے ہو؟: کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ حامد نے ٹھٹھک کر جواب دیا اور پھیکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی یار میں اپنی دکان پر جا رہا تھا

سوچا تم سے بھی ملتا جاؤں: ہاں اس منصوبے کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟ :حامد منصوبہ ٹھیک ہے دیکھو تمہاری میری پرانی ملاقات ہے' ادھر کاروبار کے لئے تمہارے پاس صرف منصوبے ہیں اور تمہارے واجبات ملنے میں ابھی کافی عرصہ لگے گا---------- یار دیکھو میں دفتروں کو سامان سپلائی کرتا ہوں اور سارا دن بلوں کی ادائیگی میں دھکے کھاتا ہوں' تم ایسا کر سکتے ہو؟ حامد نے سگرٹ سلگایا' منہ پر سے پسینے کے قطرے صاف کئے: صدیق کوئی ایسی بات نہیں۔ میری بیوی بھی ملازمت کرتی ہے: حامد تم سمجھنے کی کوشش کرو بیس سال میں ہر شخص کا ایک خاص مزاج بن جاتا ہے---------- اچھا میں چلتا ہوں۔ اس معاملے میں پیش رفت ہوئی تو مجھے ٹیلی فون کر دینا' بھابھی کو میرا سلام کہنا۔ اس کے جاتے ہی حامد کے بدن کا سارا تشنج کٹی ہوئی رسی کی طرح ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی' سب کچھ بدستور اسی طرح تھا۔ سامنے دیوار پر پرانا زنگ آلودہ کلاک نئی ساعتوں کا اعلان کر رہا تھا۔ حامد کرسی سے اٹھ کر کلاک کے قریب چلا گیا۔ اس کی قریب کی نظر مدھم ہو چکی تھی۔ اس لئے کلاک کے ہندسے صاف نظر نہیں آ رہے تھے اس نے عینک لگائی اور ایک تپائی کھینچ کر اس پر کھڑا ہو گیا۔ ہندسے واضح نظر آ رہے ہیں" میں وقت کے بہت قریب ہوں' مجھے سب کچھ واضح دکھائی دے رہا ہے۔ سمتھ اینڈ کرونہ' انگلینڈ ۱۸۹۹ء: اوہ یہ پچھلی صدی کا کلاک ہے۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک کلاک دو صدیوں کا شاہد بن جائے؟ نہیں اس نے بہت کچھ دیکھا ہے ہونے اور انہونے واقعات' اور اس نے مجھے بھی دیکھا ہے شاید وہ کچھ بھی دیکھ لیا ہے جسے میں ابھی تک نہیں بھانپ سکا' یہ کلاک اسی طرح چلتا رہے گا مجھے روندتا ہوا۔ زمانے کو تسخیر کرتا ہوا' قدیم اور جدید کے فاصلوں کو مٹاتا ہوا۔ رک جاؤ رک جاؤ' مجھے ابھی خاکی لفافے کا انتظار ہے یہ ضروری ہے یہ ایک نیا سفر ہے۔ میں نئے تعلقات کی بنیاد رکھوں گا۔

میں ہر طرح کے خوف سے آزاد ہو جاؤں گا۔ نہ کسی سے لڑوں گا نہ ایک صابر کی طرح بتیسی کو بھینچے رکھوں گا۔ باہر قدموں کی آہٹ ہوئی اور حامد ایک دم نیچے اتر کر دیوار پر معلق نقشہ دیکھنے لگا۔ شاید ڈاک آگئی ہے۔ اس نے اندر آنے والے کی طرف اضطراب سے دیکھا۔ وہ دفتر کا بل کلرک تھا جو ہاتھ میں کاغذ لئے اس کی طرف بڑھا: آپ کی تنخواہ کا بل واپس آگیا ہے: کیوں؟: آپ کے دستخطوں میں فرق ہے: کیسا فرق؟ وہ بھی اسی مہینے پڑنا تھا' کہاں ہیں دستخط؟ حامد نے غور سے اپنے دستخط دیکھے اور کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ فرق کیسے پڑ گیا ہے؟ شاید اسے پتہ چل گیا ہے کہ میں جا رہا ہوں' ابھی سے اتنی لاتعلقی' یہ تو ابتداء ہے۔ کوئی بات نہیں یہ عادت کا مسئلہ ہے۔ میرا حافظہ کمزور ہے لیکن میں اپنا نام بڑی پختگی سے ثبت کرتا ہوں۔ وہ ایک دن کہتا تھا تم اتنی قوت سے دستخط کرتے ہو کہ کاغذ پھٹ جاتا ہے اور نب ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ واقعی' میں نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔" حامد نے بل کلرک سے تنخواہ کا بل لے کر میز پر رکھا اور غور سے دیکھنے لگا۔ یہ واقعی میرے دستخط ہیں۔ مجھے تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔ اس نے ایک کاغذ پر دو تین مرتبہ دستخط کئے لیکن ہر مرتبہ اس کے دستخط پہلے سے مختلف ہوتے' وہ بار بار دستخط کرتا جاتا حتیٰ کہ سارا کاغذ بھر گیا۔ اس نے اپنے تمام دستخطوں کا مقابلہ تنخواہ کے بل پر ثبت دستخطوں سے کیا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی پیشانی پر ابھرے ہوئے پسینے کے قطرے چھوٹی چھوٹی نہروں کی صورت میں بہتے ہوئے اس کی قمیض کے کالر میں جذب ہو رہے تھے: میرے اصل دستخط کیسے ہیں؟ اس نے بے اختیاری میں سر اٹھاتے ہوئے بل کلرک کو مخاطب کیا جو پر اسرار طریقے سے مسکراتا ہوا دبے پاؤں باہر نکل گیا: اوہ کیا مصیبت ہے' اپنے آپ سے جھٹکارا پانا بھی کتنا تکلیف دہ ہے۔ میرا خیال ہے آج مجھے جواب نہیں ملے گا۔ کل چھٹی کا دن ہے بات معمول کے مطابق پھر لٹک گئی ہے۔ یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔ اس

وقت میں پنشن پر نہیں جا سکتا کیونکہ ابھی کچھ اور سال باقی ہیں۔ لیکن میں وہ نہ کر سکا جس کا وعدہ میں نے اپنے باپ سے کیا تھا۔ میں یہ وعدہ اپنے بیٹے سے لوں گا کہ جو تمہارے باپ دادا نہیں کر سکے وہ تم کرو گے۔ میں اس سے وہ چھپا لوں گا جس میں درج ہے کہ قابیل کو قتل کرنے والے سے سات گنا بدلہ لیا جائے گا۔---------- میں ان لوگوں کی شکل کبھی نہیں دیکھوں گا۔ میں بیس سالوں کی عادتوں کو یکسر بدل دوں گا۔ ان دیواروں' دروازوں اور ان کاغذوں کی یاد مجھے کبھی نہیں ستائے گی۔ وہ کہتی ہے میں احمقوں کی جنت میں رہتا ہوں۔ چند دنوں میں ہوش ٹھکانے آجائیں گی۔ تم ٹھیک کہتی ہو لیکن میں مستقبل کی سوچ کو راستے میں حائل نہیں ہونے دوں گا' میں ایک واقعہ کو جنم دینا چاہتا ہوں۔ خود ایک واقعہ بن کر دوسروں کے تمسخر اور اپنی ہتک کا تماشا نہیں بننا چاہتا' میں اپنے آبائی مکان میں اپنے حصے کو فروخت کر دوں گا اور پھر----------

اوہ' غالباً کافی دیر سے ٹیلی فون بج رہا ہے وہ مجھ سے وہ بات کرنا چاہتا ہے جو میں نہیں چاہتا۔ حامد ٹیلی فون کا ریسیور میز پر رکھ کر پھر ٹہلنے لگا' کچھ سوچ کر میز کے قریب آکر رک گیا۔ اور ایک فائل اٹھا کر پڑھنے لگا۔ گوبر گیس کو کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہوں' اس کا تعلق انسانوں کے ساتھ کیا ہے؟ حامد نے فائل زمین پر پٹخ دی۔ کیا دیہاتوں میں بینک کھولے جا سکتے ہیں؟ اس نے یہ فائل بھی پٹخ دی۔ وہ فائلیں اٹھاتا جاتا اور ان کے موضوعات کو پڑھ کر انہیں زمین پر پٹخ دیتا۔ کاغذ کے پرزے جو نہ بول سکتے ہیں اور نہ احتجاج کر سکتے ہیں۔ ان کا تعلق میرے ماضی سے ہے' یہ میری طرح نہ جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں' میں نے فیصلہ کر کے اپنی زندگی ڈھونڈ لی ہے۔ چاہے یہ کتنی مہلک ہی کیوں نہ ہو؟ یہ پرواہ نہیں کہ لوگ کیا کہیں گے؟ کیا کیا باتیں سوچیں گے؟ طرح طرح کی باتیں مجھ سے منسوب کریں گے' لوگ جو ایک دوسرے کا جہنم ہیں اپنی آگ سے بچنے کے لئے

دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ حامد کے لئے انتظار انتہائی اضطراب تھا۔ اس نے اپنا بریف کیس بند کیا سگریٹ سلگایا اور کلاک کی طرف دیکھا دو بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ مجھے اسے بہانے بنانے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔ میں نے پورے وقت تک انتظار کیا ہے اور جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ اگر اب بھی جواب نہ آیا تو پرسوں سے میں گھر میں رہوں گا یا وہ کچھ کروں گا جو کچھ مجھے کرنا ہے۔ اس نے گھنٹی بجائی اور اردلی کو اپنا بریف کیس ذاتی چیزیں اور مخصوص فائلیں کار میں رکھنے کے لئے کہا' اردلی نے اسے تعجب سے دیکھا۔

اس نے پیکٹ میں سے آخری سگریٹ نکال کر سلگایا اور اپنی کرسی سے اٹھ کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اوہ یہ کیا؟ ابھی تک پتہ ہی نہیں چلا کہ میری کرسی کی نشست کو کافی دیر سے دیمک چاٹتی رہی ہے۔ ۱' ۲' ۳' ۴' ۵' ۶' ۷' مٹی کی لکیریں۔ اس نے پیپر کٹر سے مٹی کی لکیریں کرسی کی نشست سے کھودنی شروع کر دیں۔ دیمک نے لکڑی کو گود دیا ہے' مجھے اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ حامد نے جلدی سے اپنی پتلون کے پائنچے اور سیٹ جھاڑنی شروع کی: اوہ' میری پتلون کے دونوں پائنچوں پر مٹی کی سات لکیریں ہیں۔ اس نے گھبرا کر کمرے کی دیواروں پر نگاہ دوڑائی چاروں دیواروں پر دیمک کی سات قطاریں چھت کی طرف سے نیچے اتر رہی تھیں۔ اس نے کلاک کی طرف دیکھا اس کے شیشے پر دیمک کی سات لکیریں نمودار ہو چکی تھیں۔ دیمک ہر طرف دیمک اس نے جلدی سے بریف کیس اٹھایا اور دروازے سے باہر نکلنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس کے ہاتھ کی نیلی شریانیں دیمک کی لکیروں سے چھپی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک دو مرتبہ ہاتھ جھٹکا اور تیزی سے باہر نکل گیا' اس کا اردلی حیرت سے اسے دیکھتا ہوا اس کے پیچھے سیڑھیاں اترتا گیا۔ اس نے جلدی سے موٹر کار کا دروازہ کھولا کہ ایک سمت سے ایک موٹر سائکل سوار تیزی سے آکر اس کے پاس رکا جیسے اس نے شرارت سے

"سکڈ" لگائی ہو۔ وہ جلدی سے موٹر سائیکل زمین پر پھینک کر اس کی طرف بڑھا۔ یہ آپ کے لئے لفافہ ہے ڈاک بک پر دستخط۔ حامد نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اتنی جلدی سے لفافہ اس کے ہاتھ سے چھین کر کھولا کہ خط کھلتے کھلتے آدھا پھٹ گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ افسوس کے ساتھ تمہیں مطلع کیا جاتا ہے کہ ہنگامی حالات کے پیش نظر تمہارا استعفیٰ قبول نہیں کیا جا سکتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کل مجھے پھر آنا ہے؟

حکایت

حامد نے سات دنوں میں اپنی زندگی کو بدلنے کی منصوبہ بندی تھی۔ آج ساتواں دن تھا۔ پہلے چھ دن بھی یونہی گزر گئے تھے۔ اسے اپنی بے ہمتی اور بے عملی پر بہت رنج تھا۔ اس لئے وہ صبح سے بہت متفکر تھا۔ اس نے اپنے دفتر سے جس مقصد کیلئے سات دنوں کی رخصت لی تھی وہ بھی ختم ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ حامد کی بیوی اور بچے سات دنوں کے لئے.ایک شادی میں شرکت کے لئے دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ بلکہ ابھی ابھی وہ انہیں سٹیشن پر چھوڑ کر آیا تھا۔ گاڑی صبح پانچ بجے جاتی تھی' اس لئے اسے بھی چار بجے بیدار ہونا پڑا۔ وہ ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا اور سیدھا اپنے کمرے کے قالین پر تکیہ کہنیوں کے نیچے رکھ کر اوندھا لیٹ گیا۔ اس کا کتا بھی دم ہلاتا ہوا اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ اس کے کتے کی عجیب عادت تھی جب بھی گھر کا کوئی فرد گھر سے باہر ہوتا وہ بے تابی سے کمرے اور گیلری میں چکر لگاتا رہتا۔ آج علی الصبح سب کو تیار ہوتا دیکھ کر وہ کان کھڑے کرکے ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اس کو اکیلا دیکھ کر وہ چوں چوں کرنے لگا' اس نے کتے کو ایک دو مرتبہ پیار کیا پھر یک لخت اٹھ کر اسے چین سے باندھ دیا۔ بدبخت مجھے مخل کر رہا ہے۔ آج میں بالکل آزاد ہوں آج میں وہ کام نہیں کروں گا جو ہر روز کرتا ہوں' میرے بہت سے ذاتی کاغذات الجھے ہوئے ہیں پہلے

ناشتہ کرلوں پھر کام شروع کروں گا۔ لیکن میں ناشتہ تو دفتر میں کرتا ہوں' آج میں گھر میں چائے کی بجائے کافی کا ناشتہ کروں گا کیونکہ چھٹی کا دن ہے۔ اس طرح میں وہ اپنا آپ ڈھونڈ لوں گا جو ضرورتوں' مصروفیتوں اور عادتوں کے درمیان کھو گیا ہے۔ اصل میں میری ذات بھی ایک انسانی منصوبہ ہے جس کی کارکردگی کا جائزہ ضروری ہے۔ میں دفتر کے کام کے دوران بہت سے ترقیاتی منصوبوں کا جائزہ لیتا ہوں لیکن جائزہ لینے والے کو بھی جاننا ضروری ہے۔ میں کس بحث میں الجھ گیا ہوں۔ آج یوم سبت ہے تمام آلودگیوں سے پرہیز ضروری ہے۔ جو نہ کر سکا اس کی حسرت اور جو کر سکا اس کے ملال کا اظہار کسی اور دن کروں گا۔ اس دن جو کام کے لئے بنا ہے۔ اس نے چھ دن میں کائنات تخلیق کی تھی اور ساتویں دن آرام کیا تھا۔ آج ساتواں دن ہے اور میں لمبی تان کے سوؤں گا۔ چھ دن' پھر چھ دنوں کے گھنٹے اور منٹ اور پھر سیکنڈ' اپنے علاوہ ان سب کا بوجھ اور پھر اس زمین کا بوجھ جس کے کسی طول بلد میں میرے لئے اماں نہیں ہے۔ آرام مجھ پر واجب ہے---------- حامد کرسی سے اٹھا اور کافی بنانے لگا کیونکہ آج اسے گھر ہی رہنا تھا اور اس نے ذہن میں بہت سے ادھورے کاموں کی فہرست بنائی ہوئی تھی۔ عام دنوں میں دفتر پھر اپنی بیوی کے ساتھ گھر کے کام کاج اور سودا سلف لانے کا نہ ختم ہونے والا مسلسلہ ہوتا۔ وہ اپنے جسم کو تھکاتا جاتا اور سر جھٹک جھٹک کر ہر سوچ اور ہر احساس کو اپنے آپ سے علیحدہ کرتا جاتا۔ دفتر میں اس کی مصروفیت معمولی نوعیت کی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو مصروف دکھانے پر مجبور تھا۔ وگرنہ اس کی دفتری حیثیت کم ہو جانے کا اندیشہ رہتا۔ وہ اکثر کسی نہ کسی کاغذ پر جھکا ہوا پایا جاتا اور ہاتھ میں ہیں اور ہونٹ کانپ رہے ہوتے۔ حامد کو بھی احساس تھا کہ اسے ایک مخصوص معیاد کے لئے یہاں بھیجا گیا ہے اور پھر اسے واپس بلا لیا جائے گا۔ لیکن اس کے خیال کے مطابق یہ معیاد لمبی ہوتی جا رہی

تھی۔ وہ جن لوگوں کے درمیان کام کرنے کے لئے آیا تھا وہ اسے با دل نخواستہ قبول کرنے پر مجبور تھے کیونکہ وہ ان میں سے نہیں تھا' وہ جن میں سے تھا وہ اسے ساتھ رکھنا نہیں چاہتے۔ پہلے ہی وہ لوگ جن کے درمیان وہ کام کرتا تھا اس کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے۔ ہو سکتا ہے اسے سزا کے طور پر یہاں بھیجا گیا ہو' یہ بھی ممکن ہے اس نے کوئی بد دیانتی کی ہو' بھئی اندر کا حال تو خدا ہی جانتا ہے۔ یہ کھسر پھسر کسی نہ کسی طریقے سے اس تک آ پہنچتی' لیکن وہ اس کی نہ تردید کرتا اور نہ تائید ۔ اس کو علم تھا کہ اس کی صحت کا توازن درست نہیں ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں غیر متواتر ہیں' اعصاب کھچے رہتے ہیں۔ اسے شک تھا کہ دفتر کے ڈاکٹر نے اس کی بیوی کو اس کی صحت کے بارے میں بتا دیا تھا لیکن اس نے تصدیق کو ضروری نہ سمجھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے چیک اپ کے لئے اصرار کیا پر وہ ٹال مٹول کر گیا۔ میں صحت اور عدم صحت کے نکر سے آزاد ہوں۔ میں زیادہ سے زیادہ مر سکتا ہوں اس میں کونسی غیر معمولی بات ہے؟ میری زندگی غیر یقینی ہے۔ آمدنی محدود ہے اس حصار کی تنگی سے نکلنے کے لئے وہ کام پر جاتی ہے اور میں مکمل طور پر محصور ہو چکا ہوں۔ میں کسی مستقبل کا وعدہ نہیں ہوں اس لئے میرا وجود فالتو ہے' کیا فالتو وجود کے لئے زندگی ضروری ہے؟ حامد کرسی سے اٹھ کر فلیٹ کے کمروں میں ٹہلنے لگا۔ کوئی ضروری نہیں ہے' کوئی ضروری نہیں ہے۔ رونا دھونا خلا کو پورا کرنے کی ایک رسم ہے۔ خوشی اور غم شخصی حالتیں ہیں۔ موت کے انتظار میں زندگی اور موت کے درمیان سانس لینا مویشیوں کی طرح کراہنا ہے۔ موت کا خوف یہ بتا سکتا ہے کہ میں زندہ رہا ہوں' جذباتی فیصلہ مہمل سی بات ہے۔ مجھے کسی کو اطلاع دینے کی ضرورت نہیں۔ موت کی صورت میں سب کو پتہ چل جائے گا---------- مہلت---------- کیسی مہلت' پہلے ہی بہت وقت گزر چکا ہے۔ حامد کا چہرہ

پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے ایک دو لمبے سانس لئے اور پلنگ پر اکڑوں بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اگر میں یہ کہوں کہ زندگی اور موت دونوں مہمل ہیں کہ موت کا انجام بھی موت ہے۔ شعور اور عدم شعور دونوں بے ثمر ہیں---------- میں بے مقصد یہ سوچتا رہتا ہوں کہ میں محکوم ہوں' ان کے پاس وسائل ہیں میرے پاس خواہشیں ہیں۔ انہوں نے میرے لئے ضابطے بنائے ہیں میں نے ان کی پابندی کی ہے۔ اس کے باوجود زندگی کا دریا مجھ سے دور رہا اور میں سانس لینے کو زندگی تصور کرتا رہا اور جب تنفس میں رکاوٹ محسوس کی تو پھر خود اختیاری کا حق مانگا۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔ میں کب تک اختلاف میں رہ سکتا ہوں۔ یہ حالت موت سے بھی زیادہ مہمل ہے۔ میں نہ اپنے آپ سے چھٹکارا حاصل کر سکا ہوں اور نہ---------- اس نے ایک دم ٹیلی فون کا ریسیور نیچے رکھ دیا' اس ٹیلی فون پر اس قسم کی باتیں درست نہیں ہیں۔ یہ خانگی ٹیلی فون ہے۔ مجھے سکندر سے اس بارے میں بات کرنی چاہئے۔ وہ ہنسے گا کہ اس عمر میں ایسی سوچ حماقت ہے۔ میں اسے کہوں گا نہیں میں ایک مرتبہ پہلے بھی اپنی دانشمندی کا ثبوت دے چکا ہوں۔ آج آخری دن ہے اور مجھے اپنے آپ کو اور اس زندگی کو بدلنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہے' جو سوچ عمل کے بغیر ہو وہ ہذیان ہوتی ہے۔

حامد فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس کی دائیں جانب شہر کی مرکزی سڑک تھی جس پر اکا دکا کاریں فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھیں یا کبھی کوئی تھکی ہاری ہچکیاں لیتی ہوئی بس سٹاپ پر رک جاتی لیکن وہ بھی آدھی سے زیادہ خالی ہوتی۔ آج چھٹی کا دن ہے لوگ گھروں میں آرام کر رہے ہیں یا رشتہ داروں سے اس گرمی کے باوجود میل ملاقات کے لئے جا رہے ہیں۔ میری دنیا اندر سے کتنی بڑی اور باہر سے کتنی مختصر ہے۔ خوشی کیا مصیبت کے وقت بھی میرے پاس

کوئی نہیں ہوتا۔۔۔ میں اچھوت ہوں کہ میں کسی کو نہ کچھ دے سکتا اور نہ کچھ
لے سکتا ہوں۔ حامد اور اس کی بیوی نے پندرہ سال پہلے اپنے اپنے رشتہ داروں
کو نہ ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔ دونوں کے ساس اور سسر مر چکے تھے اس لئے دونوں کا
ایک دوسرے کے خاندان سے کوئی براہ راست رابطہ نہیں تھا۔۔۔ پندرہ
سال پہلے حامد کے ایک قریبی رشتہ دار نے کہا تھا کہ اس کی بیوی صاحب حیثیت
ہوتے ہوئے بھی حیثیت کے مطابق جہیز نہیں لائی ہے۔۔ پندرہ سال پہلے اس کی

بیوی کے ایک قریبی رشتہ دار نے کہا تھا۔ لڑکے کے پاس درمیانے درجے کی
ملازمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ دونوں نے یہ دونوں باتیں سنیں اور اپنے
اپنے رشتہ داروں سے قطع تعلق کر لیا۔ میں کیسے دوست بناؤں؟ میرے پاس
کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچانے کی صلاحیت نہیں ہے۔ دفتر کی واقفیتیں دفتر ہی میں
رہ جاتی ہیں۔ عجیب باتیں کرتے ہو دوستی تو انسانی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ انسانی
بنیادوں پر وہ اپنی بیوی کا یہ جملہ دہرا کر کافی دیر ہنستا رہا تھا۔ چوکیدار کو چھٹی کے
دن اس کے دفتر میں آنے پر حیرت ہوئی لیکن اس نے جلد ہی اسے مطمئن کر دیا
کہ بہت دنوں کا کام رکا ہوا ہے۔" اور پھر میں اس منحوس کمرے میں آگیا ہوں
جہاں سے فرار کے منصوبے بناتا رہتا ہوں۔ میری زندگی' میرا وجود اور میرا ہر
عمل دو کمروں کی قید میں ہے۔ میں ایک کمرے کی سوچ لئے صبح نکلتا ہوں اور
واپس دوسرے کمرے کی سوچ لے کر پہلے کمرے میں آجاتا ہوں آج یوم سبت
ہے' نہ جانے میں کیوں یہاں آگیا ہوں۔ شاید گھر کی تنہائی کا خوف ایک دوسری
تنہائی میں لے آیا ہے وہ ٹھیک کہتا ہے کہ تنہائی اندر ہے باہر نہیں' وہ بھی ٹھیک
کہتا ہے کہ ۰ تنہائی نہ اندر ہے نہ باہر یہ صرف ایک سوچ ہے۔ آدم کی تنہائی کو
ختم کرنے کے لئے حوا کو پیدا کیا گیا لیکن پھر دونوں نے ایسی تنہائیوں کو جنم دیا کہ
سارے فلسفے اور حکمتیں ان کی تلافی نہ کر سکیں اور آدم زاد ہمیشہ کے لئے تنہا

رہا۔ حوا کی اولاد نے اسے چند لمحوں کی جسمانی لذت دے کر اس سے وہ سب کچھ
چھین لیا جس کے لئے وہ یہاں آیا تھا۔ اور پھر یہ اس کی سزا تجویز ہوئی کہ اس کے
بدن کا اسرار اور لذت خواہش کی طرح فانی ہوگی اور ابن آدم نئے ابدان کی
تلاش میں تمام شرافتوں ، نجابتوں اور رشتوں کے درمیان اسے دھوکہ دیتا
رہے گا۔ حامد دفتر کی کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہنسنے لگا اور آج اس کی ہنسی کسی نے نہ سنی
کیونکہ آج چھٹی تھی اور وہ کسی دوست کے پاس جا کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے
کی بجائے اپنی باتوں کو خود ہی سننا چاہتا تھا۔" اگر میرے دل میں چور نہیں تو پھر مجھے
ایک دم ٹیلی فون بند نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میرا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اس کا
ایک بچہ ہے' شوہر سپین میں کام کرتا ہے۔ وہ اس کے پاس جانا چاہتی ہے۔ وہ
میری بیوی کے ساتھ ایک دن دفتر کچھ کاغذ تصدیق کرانے آئی تھی' اس کی
آنکھوں ،میں غیر معمولی چمک' ایک بلاوا تھا۔ وہ کبھی کبھی مجھے دفتر میں ٹیلی فون
کرتی ہے۔ کبھی ادھر کی اور کبھی ادھر کی لیکن سب کچھ بے معنی ہے۔ وہ کیا چاہتی
ہے؟ میں زندگی کی تمام رعنائیوں سے دستبردار ہو چکا ہوں۔ ایک گرہستی کے
عوض دوسری کو مول نہیں لے سکتا۔ یہ فیصلہ میں بہت پہلے کر سکتا تھا۔ وہ میڈرڈ
یونیورسٹی میں انگریزی پڑھتی تھی۔ وہ ہر قیمت پر ساتھ آنے کو تیار تھی۔ مجھے ہر
قیمت پر وہاں رکھنے پر آمادہ تھی۔ میں نے اسے ایئرپورٹ پر کہا تھا۔ یہ جذبات
عارضی ہیں اور ہم ایک دوسرے کے لئے ہمیشہ اجنبی رہیں گے۔ اس نے جواب
میں صرف اتنا کہا تھا۔ تم آدم کے بیٹے ہو۔ اس نے آج ٹیلی فون کیوں کیا تھا؟ میں
بدن کے عوض بدن کا عوضانہ دے سکتا ہوں لیکن مشروط
نتائج۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اوہ میں بھٹکتا جا رہا ہوں؟ نہیں مجھے اس سے پوچھنا
چاہئے کہ وہ مجھے کیوں ٹیلی فون کرتی ہے؟ حامد نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے
ریسیور اٹھایا اور نمبر گھمانے لگا لیکن دو نمبر گھمانے کے بعد پھر رک گیا۔ میں نے

کبھی اس کے وجود کو اتنی اہمیت نہیں دی اور نہ ہی اس کے بارے میں سوچا ہے، کیونکہ سوچ مستقبل کی طرف لے جاتی ہے اور میرا مستقبل کوئی نہیں ہے۔ میں وعدہ بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے اسی طرح رہنا چاہئے' موت اور زندگی کے درمیان' فیصلہ اور عدم فیصلہ کے درمیان' ایک ایسی گرہستی کے درمیان ہے' ایک ایسے نظام کے درمیان جو ہر فیصلہ خود کرتا ہے۔

حامد فٹ پاتھ پر آہستہ چل رہا تھا اور دھوپ تیز تھی اور جسم میں خون کی گردش تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ فٹ پاتھ ختم ہو چکا اور وہ ایک چوراہے کے پاس کھڑا چاروں سڑکوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے کس طرف جانا ہے؟۔ اس لایعنی وجود کو گھسیٹتے ہوئے---------- لیکن آج یوم سبت ہے اور پرہیز واجب ہے' اور میرا ساتواں دن بھی اکارت گیا۔ کل وہی کچھ ہو گا جس سے میں بھاگنا چاہتا تھا۔

تمثیلیں

تمثیل ۱

شل کر دینے والی سردی۔

خنجر کی طرح کاٹتی ہوئی ہوا اور گھائل کرتی ہوئی بارش۔

ایئرپورٹ کا رن وے پانی میں شرابور۔

آنے والوں کو خوش آمدید کہنے والے چھتریوں' سائبانوں کے نیچے ٹھٹھرتے اور اپنے آپ کو سمیٹ رہے ہیں' جہاز کے قریب ایک پرانی ہچکیاں لیتی اور دھواں اگلتی ہوئی مسافر بس گینگ وے پر جہاز کے دروازوں میں ایک دوسرے کو دھکیلتا ہوا ہجوم' چہروں پر توقع اور مسرت سے گودے ہوئے نقش' بارش کی چادر کو چھلنی کرتی ہوئی متلاشی نظریں' ننگے درختوں' چھتریوں اور سائبانوں کے نیچے ہلتے ہوئے ہاتھوں کی شناخت کے لئے مضطرب نگاہیں' آنے والوں کے ہاتھوں' کندھوں اور کمروں کے ساتھ لٹکے ہوئے تھیلے۔

برف گر رہی تھی اور وہ جہاز میں سوار ہونے والی آخری مسافر تھی جو سوچ سوچ کر قدم اٹھا رہی تھی۔ بارش برس رہی ہے اور وہ جہاز میں سے اترنے والی آخری مسافر ہے جو سوچ سوچ کر نیچے اتر رہی ہے۔ اس کے پاس کوئی تھیلہ نہیں کوئی وینٹی باکس نہیں۔ صرف براؤن رنگ کا پرس کندھے پہ حمائل ہے۔ براؤن رنگ کا چرمی کوٹ' براؤن پتلون نما پاجامہ' اور سر پر براؤن ریشمی رومال سیاہ چشمہ جو نظر کا نہیں' غالباً اپنی شناخت کو اوجھل کرنے کے لئے پہنا ہوا ہے۔

اپنی آمد کی اطلاع دینا ضروری نہیں۔ روزانہ مسافر آتے اور جاتے ہیں اس نے جاتے وقت نہ کسی کو بتایا تھا اور نہ آتے وقت۔ شہر میں اس کی دو بہنیں اور ایک بھائی ہے اور اس شہر میں ایک ان دیکھا سسرال بھی۔

بس تیز ہچکیاں لے رہی ہے۔ ڈرائیور بار بار ایکسیلیٹر دبا کر ہوا میں دھوئیں کے غبارے بنا رہا ہے۔ ڈیش بورڈ پر ہوائی کمپنی کا ملازم اسے جلدی نیچے اترنے کے لئے اشارے کر رہا ہے۔ وہ ہاتھ سے نفی کا اشارہ کرتی ہے۔ ہوائی کمپنی کا ملازم کندھے سکیڑتا ہے بس آگے بڑھتی ہے۔ گینگ وے پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ رن وے پر ہوائی کمپنی کی کاریں اور جیپیں پانی اچھالتی ہوئی ادھر ادھر بھاگ رہی ہیں۔ وہ بارش میں بھیگی ہوئی لاؤنج کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہی ہے جہاں سے وہ اندیشہ لے کر گئی تھی اب اعتماد کے ساتھ واپس آئی ہے۔ اس کا پرس اتنا پھولا ہوا ہے کہ وہ سارے انسانی رشتے خرید سکتی ہے۔ اس مکان کو بھی جس میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ جس میں اس کے ماں باپ نے باری باری جان دی تھی۔ جس میں سے ایک ایک کر کے اس کی بہنیں رخصت ہوئی تھیں۔ جسے اس کا بھائی ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا تھا' جس میں وہ ایک دن اکیلی رہ گئی تھی۔ اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے اسے ایک بینک میں معمولی سی نوکری کی مجبوری تھی۔ وہ سات سال تک یہی کچھ کرتی رہی۔ اس کی حیثیت معمولی تھی اس لئے سات سال تک کسی نے اسے نہ پوچھا۔ ایک نوکرانی اس کی ساتھی تھی۔ دو پرانی سہیلیاں اسے اکثر ملنے آتیں۔ لیکن آج اسے کوئی ملنے نہیں آیا ہے۔ گینگ وے کی آخری سیڑھی سے ایئرپورٹ کی لاؤنج تک بہت ہی طویل راستہ ہے اور راستے میں دو شہر ہیں' ایک وہ شہر جس میں وہ اپنے دو بچوں اور کم عمر خاوند کے ساتھ آباد ہے' دوسرا وہ شہر جو ویرانے میں تبدیل ہو چکا ہے اور جس کی سیاحت کے لئے وہ ہزاروں میلوں کے سفر کے بعد آئی ہے۔ ان گلی

کوچوں' بازاروں اور درسگاہوں کو دیکھنے کے لئے جہاں امید ہر ایک کو مستقبل کا فریب دے کر بدن کا خراج لیتی ہے' جہاں یہی امید دیوانگی بن کر سڑکوں کی اور یادوں کی بھول بھلیوں میں اسے لئے پھرتی ہے جو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ سوچ سمجھے بغیر اس شہر میں خاوند کی مرضی کے بغیر چلی آئی ہے۔ اس کو طرح طرح کے خدشے ہیں۔ اس کا خاوند اس سے دس سال کم عمر ہے' اس کا سسرال اسے قبول نہیں کرے گا حالانکہ اس نے ان کے بیٹے کو ایک مستقبل دیا ہے۔ وہ چلتے چلتے رک گئی ہے۔ تیز بارش پھوار میں ڈھل گئی ہے۔ اس نے پرس سے آئینہ نکال کر اپنا چہرہ دیکھنا چاہا ہے لیکن بارش کی پھوار اور منہ کی بھاپ سے آئینہ دھندلا گیا ہے۔ اس نے اپنے کوٹ کی آستین سے ایک دو مرتبہ اسے صاف کیا ہے لیکن چہرہ پھر بھی صاف طور پر نظر نہیں آتا۔ اس نے آئینہ پرس میں ڈال کر ایک جھٹکے سے بال پیشانی سے ہٹائے ہیں اور کندھے سکیڑتے ہوئے متذبذب قدم آگے بڑھائے ہیں۔ اس گھر کی پرانی کنجی اس کے پرس میں ہے۔ لیکن وہ وہاں نہیں جائے گی۔ اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں رہے گی۔ اسے پرواہ نہیں کہ ہوٹل میں اس پر شک کیا جائے کہ ایک ادھیڑ عمر کی متمول قبول صورت جو یہاں کی زبان میں بات کرتی ہے اور جس کا پرس بھی پھولا ہوا ہے۔ وہ تنہا ہوٹل میں کیوں رہ رہی ہے؟ وہ بچوں کے لئے کچھ نہیں خریدے گی کہ وہ طرح طرح کے سوال کریں گے اور پھر یادوں کا پٹارہ کھل جائے گا۔ وہ وہاں یہاں کے خواب دیکھتی ہے اور یہاں وہاں کے بارے میں سوچتی ہے اور اب یہ سوچتی ہے کہ سب سوچوں نے اسے گھیر لیا ہے۔ اسے یہاں کس چیز کی کشش لائی ہے۔ اس کا یہاں رہنا دوبھر کر دیا گیا تھا یہ اتفاق تھا کہ اس کی شادی میں تاخیر ہو گئی تھی۔ اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ اس کی شکل بھی اس کے طبقے کی طرح متوسط تھی۔ اس لئے وہ ملازمت بھی کرتی تھی اور بینک میں ہر کوئی اس کے بدن کا استعمال چاہتا

تھا۔ اسے وہاں جا کر معلوم ہوا ہے کہ بدن اتنا اہم نہیں ہے جتنا اسے یہاں بنا دیا
گیا ہے۔ زندگی اس سے شروع ہو کر اس سے ماوراء ہو جاتی ہے۔ اسے اپنا
خاوند اتنا پسند نہیں جتنا اسے ہونا چاہئے۔ اس کی شادی اس وقت ہوئی جب وہ
بہت سے مردوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ایک سے وابستہ ہونے میں
حفاظت دیکھتی تھی۔ ایک سفید فام اس سے شادی کا خواہشمند تھا لیکن وہ ڈر گئی
تھی۔ اسے کوئی رنگدار قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کیونکہ اس کا معاشرتی
وجود کسی وعدے کا اشارہ نہیں تھا۔ اس کا جسمانی وجود کسی لذت اور رعنائی کا
دعویدار نہیں تھا۔ یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا وہ اپنی خالہ زاد بہن کے گھر میں
ایک کمرے میں رہتے رہتے تنگ آ گئی تھی۔ وہ آزاد زندگی چاہتی تھی۔ لیکن اس
آزادی کی قیمت دینی ضروری تھی۔ وہ صبح یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور شام کو اسی
سٹور میں کام کرتا تھا جس کی وہ انچارج تھی۔ وہ ابھی اور پڑھنا چاہتا تھا لیکن اس
کے قیام کی مدت ختم ہو رہی تھی۔ اس نے ایک دو دن کی گفتگو کے بعد شادی کر
لی۔ کیا اس کا خاوند واقعی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا یا اسے اس ملک کی شہریت
درکار تھی؟ اس نے کئی مرتبہ اپنے آپ سے سوال کیا ہے۔ اس کے خاوند نے
دو سال بعد اس شادی کی گھر اطلاع بھیجی' خطوط کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع
ہو گیا۔--------- دونوں خوش بھی تھے اور نہ خوش بھی۔ وہ دس سال
کے بعد اس ایئرپورٹ پر ہے۔ پہلے روانگی کے لاؤنج میں تن تنہا تھی۔ اب واپسی
کے لاؤنج میں تنہا ہے۔ بارش تھم چکی ہے وہ لاؤنج میں آخری مسافر ہے۔ وہ ابھی
کچھ فیصلہ نہیں کر پائی۔ وہ اسے کیسے قبول کر سکتے ہیں۔ حالانکہ اس کے سارے
اخراجات اس نے اٹھائے ہیں۔ وہ اسی کے پیسے یہاں انہیں ہر مہینے بھیجتا رہا ہے۔
ہو سکتا ہے اس نے اس کی تصویر ان کو بھیج دی ہو۔ اس نے ان کی بھوت ایسی
شکلوں کو تصویروں میں دیکھا ہوا ہے اسے نفرت سے نفرت ہے' نفرت ناپسندیدگی

ہے۔ اسے کسی نے قبول نہیں کیا ہے۔ اس کے خاوند نے بھی اسے ضرورت کے
تحت قبول کیا ہے۔ وہ عمر کی رفتار سے خائف ہے کہ ایک دو سالوں میں وہ اسے
چھوڑ دے گا۔ اس کے پاس اتنے پیسے ہیں کہ وہ ایک اور خاوند خرید سکتی ہے۔
لاؤنج سے باہر جا بجا پانی کے تالاب پھیلے ہوئے ہیں اور ٹیکسی سٹینڈ پر بے شمار
متلاشی نگاہیں ایک دوسرے کی تلاش میں ہیں۔ سارے چہرے اس طرح ہیں جس
طرح وہ ان کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر گئی تھی -----وہ ہجوم کو کاٹتی ہوئی
پرس لٹکائے بے چین ہاتھوں میں وینٹی باکس ہلاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی مگر یہ
فیصلہ نہیں کر پائی اسے کہاں جانا ہے؟ ہجوم نے راستہ روکا ہوا ہے۔ کالی اور
جامنی رنگت کے چربی کے ستون' رنگ دار ساڑھیاں اور گائے کی گھنٹیوں ایسے
زیور تیز ہوا سے ہل رہے ہیں۔ ہاتھوں میں نوٹوں کے ہار چہروں پر مسرت اور
چمکدار تھیلوں پر تیز نظریں اور پھر مختصر معانقے وہ کہاں غائب ہو گئی ہے؟ یہ وہی بلا
ہے اس نے سیاہ چشمہ لگایا ہوا ہے۔ وہ اپنی تصویر سے ملتی جلتی ہے اس نے اچٹتی
نظر سے ایک چہرے کے پروفائل کی طرف دیکھا اور جلدی سے ہجوم میں کھو گئی
ہے۔ دونوں نے ایک دوسری کو دیکھا ہے۔ دونوں شناخت نہ کرنے کا بہانہ کر رہی
ہیں۔ وہ ایک ٹیکسی میں جا بیٹھی ہے جو ایک جھٹکے کے ساتھ حرکت میں آ گئی ہے۔
دونوں طرف درخت بھاگتے ہوئے جا رہے ہیں۔ وہ کھڑکی سے سر باہر نکال کر
ادھر ادھر سر گھما رہی ہے۔ ابھی کسی شے کی شناخت نہیں کر پائی کہ نظر سے
اوجھل ہو جاتی ہے۔ راستے میں کئی موڑ آئے ہیں۔ ڈرائیور نے اس کی طرف
دیکھا ہے۔ اس نے سیدھا چلنے کا اشارہ کیا ہے۔ سیدھا راستہ ختم ہونے کو نہیں
آتا۔ باہر دیکھ دیکھ کر اس کی آنکھیں چکرانے لگی ہیں۔ سیدھا راستہ چلتے چلتے
ایک موڑ کی طرف مڑ جاتا ہے۔ ٹیکسی راستے کا ساتھ دیتی ہے۔ ڈرائیور پھر پیچھے
دیکھتا ہے وہ پھر سیدھا چلنے کا اشارہ کرتی ہے۔ وہی راستے ہیں وہی دکانیں وہی

مکان، سب کچھ اسی طرح جس طرح وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ اس کا شوق اس کی دھڑکن، اس کے وہ خواب جو ان راستوں پر چلتے تھے۔ ایک دم ماند ہو گئے ہیں۔ اس نے ہوٹل کے سامنے ٹیکسی روکنے کا اشارہ کیا ہے۔ ڈرائیور نے ایک دو مرتبہ پہلو بدل کر سگریٹ سلگا لیا ہے۔ اس نے پھر چلنے کا اشارہ کیا ہے۔ عمارتیں اور درخت بھاگنے لگے ہیں۔ راستے میں اس کی سہیلی کا فلیٹ ہے اس نے گردن باہر نکالی ہے لیکن بالکونی خالی ہے۔ سرخ بتی کے جلتے ہی ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی ہے۔ بائیں جانب وہی بینک ہے اور وہی گارڈ کھڑا ہے اس کی بندوق پر زنگ آیا ہوا ہے اس کے لئے وہی باہر سے چیزیں لایا کرتا تھا۔ اس نے ابھی اچھی طرح اسے پہچانا بھی نہیں کہ سبز بتی نے راستہ دے دیا ہے۔ سب کچھ اس طرح نہیں ہے جیسے وہ سمجھ رہی ہے۔ گارڈ کے سارے بال سفید ہو چکے ہیں۔ وہ کسی بہن بھائی کی طرف جا کر کیا کرے گی؟ اس نے سگریٹ سلگا لیا ہے اور ڈرائیور نے غلط گیئر بدل کر ٹیکسی کو جھٹکا دیا ہے۔ اس نے ڈرائیور کو ایک کشادہ سی سڑک کی جانب مڑنے کا اشارہ کیا ہے اور تمام مکانوں کو دیکھ رہی ہے۔ شدید سردی کی وجہ سے مکانوں کے باہر کوئی بچہ نہیں کھیل رہا ہے۔ بادل اور سردی کی وجہ سے سرشام ہی اندھیرا اتر رہا ہے اس نے ایک مکان نما بنگلے کے سامنے اشارہ کے ساتھ ٹیکسی رکوائی ہے۔ اور جلدی سے اپنے پرس میں سے پرانی کنجی ٹٹولتی ہوئی ٹیکسی سے باہر نکلی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور میٹر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ سیاہ چشمہ اتار کر مکان نما بنگلے کو غور سے دیکھ رہی ہے۔ گیٹ پر "برائے فروخت" کی تختی ہوا سے سر پٹخ رہی ہے۔ اس نے ایک انگلی سے تختی کی جنبش کو روکا ہے لیکن انگلی ہٹاتے ہی وہ دیوانہ وار سر پٹخنے لگی ہے۔ اس نے پھر سگریٹ سلگایا ہے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو سیدھا چلنے کا اشارہ کیا ہے۔ ٹیکسی سیدھی بھاگتی چلی جا رہی ہے۔ اسی راستے پر جہاں سے وہ آئی ہے۔ درخت

اور عمارتیں اسی طرح پیچھے اور ساتھ ساتھ بھاگتے جا رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں ایک ایک کر کے سارے حرف بجھتے جا رہے ہیں۔ موسم کی خرابی کی بدولت ٹریفک بہت کم ہے۔ ایئرپورٹ ویران ہے۔ لاؤنج میں نصب لاؤڈ سپیکر کی ناقابل فہم بازگشت ہے، وہ کاؤنٹر پر پہنچ گئی ہے۔ جلدی جلدی اس نے اپنا ٹکٹ کاؤنٹر پر رکھا ہے اور کاؤنٹر پر جھکے ہوئے وردی میں ملبوس اہلکار سے کچھ کہا ہے جو سنائی نہیں دے رہا ہے۔ لاؤڈ سپیکر خاموش ہو گیا ہے۔ آپ کو ایک خالی سیٹ اتفاق سے مل گئی ہے، جہاز روانہ ہونے والا ہے اور تین گھنٹے کے بعد آپ کو آگے کنکٹنگ فلائٹ مل جائے گی۔ کاؤنٹر پر موجود اہلکار نے اس کی ٹکٹ پر مہر لگائی ہے۔ وہ پیچھے دیکھے بغیر تیزی سے روانگی کی لاؤنج میں داخل ہو رہی ہے۔

تمثیل ۲

اسے نئی کالونی میں آئے ساتواں دن ہے۔ بڑی تگ ودو کے بعد اسے مشرقی بلاک میں ایک تین منزلہ عمارت کی فرشی منزل رہائش کے لئے دی گئی ہے۔ پہلے وہ ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں رہتی تھی جہاں چاروں طرف کمروں میں اپنے ہم جنسوں کی موجودگی اسے خلوت میں تنہا نہ رہنے دیتی۔ تینوں وقت میں ایک ہی طرح کا بے کیف کھانا اور صحن کے گرد ایک بہت ہی اونچی فصیل اسے ترغیب دیتی کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر باہر چلی جائے' لیکن وہ رک جاتی کہ اسے باہر سے اندر آنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ ایک شام اس نے ملحقہ کمرے میں مقیم فلسفہ کی ایک مطلقہ لیکچرار سے کہا: کمرے کی دیواریں باہر صحن کی دیواریں' دو جنسوں کی دیواریں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ سب کیوں ہیں؟" مطلقہ فلسفہ پڑھانے والی مسکرانے لگی:" اس عمر میں یہ سوال ہے؟ بدن کی سب سے اونچی دیوار کو پھلانگنا ضروری ہے۔ باقی سب خیالی ہیں۔ اس نے مجھے اپنی عادات میں ڈھالنا چاہا۔ میں نے کہا۔ میرا وجود الگ ہے۔ تو پھر ہمیشہ کے لئے تم الگ کیوں نہیں رہتیں؟ تمہاری مرضی اور پھر میں اس ہاسٹل میں آگئی وہ مجھ سے بور ہو چکا تھا اور میں اس سے تھک چکی تھی۔ زندگی کو ناپسندیدگی میں بسر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ باتیں سن کر کچھ بے مزہ سی ہو کر واپس اپنے کمرے میں آگئی اور اپنے دفتر سے لائی ہوئی

فائلوں میں مگن ہو گئی۔ صبح پھر وہی دفتر جس میں چاروں طرف مرد لیکن وہ مردوں کو سنبھالنا جانتی ہے۔ سوائے ایک آدمی کے اس نے تمام کو سلام دعا کی حد تک روکا ہوا ہے۔ یوں بھی اس کا عہدہ معقول ہے اور عمر کے اس حصے میں ہے جہاں مرد متذبذب ہو جاتے ہیں۔ دفتر کے بعد اس کا کوئی خاص ملاقاتی بھی نہیں ہے۔ والدین کبھی کے مر چکے ہیں اور دوسرے بہن بھائی کانپور میں رہتے ہیں۔ یہاں وہ اپنے ماموں کے پاس چھٹیاں گزارنے آئی تھی اور پھر یہیں کی ہو کر رہ گئی۔ یہاں کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ اور کافی مخالفت کے بعد شادی کر لی۔ خاوند پنجابی تھا' وہ پنجابیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔

اسے نئی کالونی میں آئے ہوئے ساتواں دن ہے۔ موسم غیر یقینی ہے۔ کبھی حبس اور کبھی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا' وہ قالین پر اکڑوں بیٹھی گھٹنوں کو دونوں بازوؤں کی لپیٹ میں لئے ان پر ٹھوڑی رکھے ہوئے گنگناتی ہوئی رک گئی ہے۔ آج وہ دفتر سے جلدی آگئی ہے۔ باورچی خانے میں ملازمہ کھانا پکا رہی ہے۔ کل چھٹی کا دن ہے وہ بھی اتوار کی چھٹی ہے۔ اسے کہیں نہ آنا ہے اور نہ جانا۔ اس کی کوئی خاص سہیلی نہیں ہے۔ اس کی بیٹی اور اس کے سسرال دوسرے شہر میں ہیں۔ اس کا اپنا سسرال اسی شہر میں ہے۔ شاید وہ اس کے وجود سے بے خبر ہو چکے ہیں۔ ہر دو میں جو ربط تھا وہ پندرہ برس پہلے ایک ہوائی حادثے میں جان دے چکا تھا۔ بہت رسہ کشی ہوئی اس نے اس کا سب کچھ ان کے حوالے کر دیا۔: ایک لڑکی ہے وہ آپ کے حوالے نہیں کروں گی۔ انہوں نے کچھ دنوں تک سوچا کہ لڑکا ہوتا تو پھر جنگ بھی کی جاتی۔ اس بوجھ کو نہ ہی اٹھایا جایا۔ اس نے اپنے بارے میں طرح طرح کی باتیں سنیں لیکن وہ خاموشی سے دفتر میں کام کرتی رہتی۔ کئی مرتبہ اس کے ماموں کی اولاد نے اسے شادی کی ترغیب دی: بس ایک ہی کافی ہے' زندگی کو صرف ایک دفعہ ہی بسر کیا جا سکتا ہے' سب کچھ بے مزہ ہے۔ اس کی

نے ایک کمرے میں پندرہ سال قید تنہائی کاٹ کر اپنی موجودگی سے انکار کیا ہے کیونکہ وہ ترغیب سے ڈرتی ہے۔ لیکن میں نے کیوں وہ کمرہ چھوڑ دیا ہے؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا ہے۔ اب للی کو میری ضرورت نہیں ہے۔ نہیں یہ غلط ہے اگر تم دوسری شادی کر لیتیں تو پھر تمہاری پنشن بند ہو جاتی اور تمہاری اپنی تنخواہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ غلط ہے' غلط ہے اس نے ایک دو مرتبہ پاؤں سے زمین کا چہرہ مسلا اور جلدی سے اپنے بیڈ روم میں آگئی ہے۔ نوکرانی نے کھانے کا پوچھا ہے اس نے انکار کر دیا ہے۔ خاموشی چغل خور ہوتی ہے' ذہن کو سازشی بنا دیتی ہے: میری جگہ اگر وہ ہوتا تو کبھی کا دوسری شادی کر چکا ہوتا۔ وہ اپنے بیڈ سے اٹھی ہے اور افریقی سمون کا کیسٹ سننے لگی ہے۔ افریقی ڈھول کی گھن گرج بڑھتی جاتی ہے۔ تیز چیختی ہوئی کے ساتھ اس کا دل سکڑ جاتا ہے اور دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اس کا چہرہ حدت سے تمتما رہا ہے۔ دانتوں کو پیستے ہوئے اس نے دونوں ہتھیلیوں سے کنپٹیوں کو دبایا ہے جو دہک رہی ہیں۔ کچھ دیر کے بعد اس نے تھرمامیٹر سے بدن کی حرارت دیکھی ہے جو نارمل ہے۔ اس نے کیسٹ بند کر دیا ہے اور ایک لمبا سا سانس لیا ہے: یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ ہاسٹل میں کبھی ایسا نہیں ہوا جب سے اس کالونی میں آئی ہوں' اندر ہی اندر کچھ کاٹتا جا رہا ہے۔ مکان میں آسیب معلوم ہوتا ہے۔ یہ ساری کالونی ہی ایسی ہے۔ یہاں وہی ہیں جن کی زندگی میں امید ختم ہو چکی ہے۔ جو ایک دائرے کے اندر رہنے پر مجبور ہیں۔ جن کے ذرائع محدود ہیں جن کی امیدیں اچھے وقت کی منتظر ہیں۔ للی کا ابھی تک کوئی خط نہیں آیا۔ اس کی اچھی جگہ شادی کرنے کے لئے ضروری تھا کہ میں اپنی موجودگی کا انکار کرتی' اندھیرے میں اپنی دھڑکنوں کو سنتی اگر کوئی قدم لیتی تو سب ہنستے کہ ایک ادھیڑ عمر نے شادی کی ہے۔ وہ کہتے کہ میں بے وفا ہوں۔ اس لئے اس کی پنشن بند کی جانی ضروری ہے۔ نوکری تو اس حادثے کے پانچ

سال بعد ملی ہے نوکرانی باورچی خانے میں سو گئی ہے۔ اس نے سارے کمرے بند کئے اور کار کی بتیاں جلائے بغیر تیزی سے کالونی سے باہر نکل آئی ہے۔ ٹریفک کسی قدر کم ہے موسم غیر واضح ہے۔ وہ موٹر کو آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے یونیورسٹی سے باہر اس درخت کے پاس لے آئی ہے جہاں انہوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے کار سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ درخت سوکھ چکا ہے اور اس کے تنے پر ان کے ناموں کے زخم بھر چکے ہیں۔۔ وہ کار میں واپس آگئی ہے اور تیزی سے ایکسیلیٹر دبایا ہے کار چیختی ہوئی بھاگی ہے۔ اس نے پھر کار کی رفتار سست کر دی ہے۔ میں کیا کر رہی ہوں؟ بہتر ہے کہ کچھ کھا کر سو جاؤں' زندگی ان سڑکوں پر نہیں ہے۔ اب سب کچھ گزر چکا ہے۔ وہ احمق دفتر میں مجھے خوش کرنے کے لئے میرے سارے کام کرتا ہے۔ ٹھیک ٹھاک افسر ہے اس کی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے اسے مجھ میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ وہ شہر کا بڑا پل عبور کرتی ہوئی سٹیڈیم کے پاس پہنچ گئی ہے اور ایک کافی بار کے سامنے کار روک دی ہے۔ کچھ دیر کے بعد ایک اونگھتا ہوا بیرا اس کے پاس آیا ہے۔ اس نے کافی پینے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اور انتظار میں سگریٹ سلگا لیا ہے سگریٹ کا شعلہ دیکھ کر بینڈ سیم میں گھومتے ہوئے نوجوان آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے ہیں اس نے مسکراتے ہوئے کار کا شیشہ نیچے کیا ہے اور اس کے دل کا آہنگ بدل گیا ہے: نہیں یہ ممکن نہیں ہے' میرا سب کچھ بیت چکا ہے۔ میں للی کے پاس نہیں رہ سکتی۔ سب کچھ چھوڑ کر کسی بھائی یا بہن کے پاس بھی نہیں جا سکتی۔ یہ ایک مداخلت ہے شادی؟ نہیں' وہ میری جگہ ہوتا تو اس پر کوئی انگلی نہ اٹھاتا۔ مجھے یہ حق نہیں مل سکتا۔ بے شک پنشن بند ہو جائے اب کتنی عمر باقی ہے نہیں مجھے یونہی رہنا ہے جب تک میرا سانس بند نہیں ہو جاتا۔ جب تک میری کائنات کا ہر ذرہ خاموش نہیں ہو جاتا' اس نے کار کے سٹارٹر کو دبایا لیکن کار ایک ہچکی کے بعد رک گئی۔ وہ دوبارہ

سٹارٹر کو دبایا لیکن کار ایک ہچکی کے بعد رک گئی ہے۔ وہ دوبارہ سٹارٹر کو دبانے لگی ہے کہ کار کی پچھلی جانب سے ایک سایہ اس کی طرف بڑھا ہے اور اس کی دائیں جانب ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں کھڑا ہو گیا ہے۔ اس نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا ہے۔ وہ سکتے میں آ گئی ہے۔ اس کے دفتر کے نوجوان رفیق کار نے مسکرا کر اسے سلام کیا ہے۔

"آپ اس وقت کدھر؟"۔

"بیگم صاحبہ، میرا گھر پاس ہی ہے بس یونہی ٹہلنے کے لئے ادھر آ گیا ہوں۔"

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں اور ان کی خاموشی گہری ہوتی جا رہی ہے۔

"چلئے میں آپ کو ڈراپ کر آتی ہوں۔"

"نوجوان قدرے ہچکچاہٹ کے بعد کار میں سوار ہو گیا ہے۔ کار کی رفتار اس کے دل کی دھڑکن کی طرح تیز ہے۔۔

"کیا آپ واقعی اپنے گھر جانا چاہتے ہیں؟"۔

"نہیں، نوجوان نے جواب دیا ہے۔ اس نے کنکھیوں سے اسے دیکھ کر کار کا رخ اپنے گھر کی طرف موڑ دیا ہے۔

تمثیل ۳

وہ میرا مسئلہ تو نہیں ہے۔

البتہ میرا اہم نام ضرور ہے۔

ہم ایک دوسرے کو ناموں سے نہیں پکارتے ہیں، جب بھی کوئی ملاقاتی کسی ایک کا نام پکارتا ہے ہم دونوں متوجہ ہو جاتے ہیں۔ پھر ہم دونوں فیصلہ کرتے ہیں کہ کس کو پکارا گیا ہے۔ ہم سب یعنی میں، وہ اور کچھ اور لوگ، ایک ۱۵x۲۰ کے کمرے میں کام کرتے ہیں اس کمرے کا ۱۵x۸ حصہ میرے پاس ہے ـــــــــــــــ ۱۵ x ۱۲ ان کی تحویل میں ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک چوبی دیوار اور اس میں نصب ایک چرچراتا ہوا دروازہ ہے۔ دیوار کے نصف حصے پر گدلے شیشے جڑے ہوئے ہیں کہ ۱۵x۱۲ میں کام کرنے والوں کی نگرانی کی جا سکے۔ میں نے ان گدلے شیشوں پر خاکی کاغذ چسپاں کروا دیئے ہیں جن میں سے اکثر پھٹ چکے ہیں۔ یہ کمرہ بہت سے دوسرے کمروں کی طرح ایک قدیم لیکن کشادہ عمارت کا حصہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ راجدھانی کے شہہ سواروں کا تاریخی پڑاؤ تھا۔ اب اس کے آس پاس ایک اور شہر آباد ہو چکا ہے۔ نئے شہر والے اس عمارت کو بھول بھلیاں بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ ہر صبح بے شمار لوگ اس کے اندر جاتے ہیں اور پچھلے پہر مضطرب اور

متفکر چہرے لٹکائے ہوئے' بڑی کشمکش کے بعد اس کے منہ سے باہر نکلتے ہیں۔ یہ اپنا روگ بتانے سے قاصر ہیں اور چوراہے کی صلیب پر رکی ٹریفک میں کھو جاتے ہیں۔ روز یہی ہوتا ہے اور پھر ایک دن وہ اپنی اولاد کی درخواستیں تھامے ہوئے انہیں کرسیوں کے سامنے گڑگڑاتے ہیں جن کو کبھی انہوں نے مضبوط کیا تھا' شاید اسی لئے اس کو بھول بھلیاں کہا جاتا ہے جس کے ایک ۱۵x۲۰ میں' میں' میرا ہمنام کام کرتے ہیں۔ ان حدود کے اندر میرا حکم چلتا ہے۔ ایک دن اس نے جنجھلاہٹ میں کہا: اصل میں یہاں کس کا حکم چلتا ہے؟: ہمیں اس کے بارے میں نہیں سوچنا چاہئے۔ میں نے تنبیہہ کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم سارا دن کام کرتے ہیں لیکن پھر بھی سرزنش کی جاتی ہے کہ کام نہیں ہو رہا' ہمیں ۱۵x۲۰ میں اپنے علاوہ ہر ایک کو جواب دہ ہیں۔۔ ہمیں اس کی عادت ہو چکی ہے۔

میرے ہم نام کے منہ میں زبان نہیں' دن بھر سرنگوں کام میں گم' وقت سے پہلے کمرے کی دہلیز عبور کرنا' دفتر کے وقت کے بعد شام تک اپنی سیٹ پر جتے رہنا' ماتحت عملہ کی میز پر خود فائلیں لے کر جانا اور ان کی میزوں سے فائلیں اٹھا کر واپس اپنی نشست پر لانا' عین ۳۰۔۱ بجے نماز کے لئے کاندھے پر تولیہ لٹکا کر کمرے سے باہر نکلنا' چہرے پر نہ کوئی تقاضا عیاں' نہ کسی خواہش کی پریشانی' جسم چھریرا' ناک ستواں' آنکھیں تاثر سے محروم' اس نے چہرے کی بجائے ماسک پہنا ہوا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔ وہ دن میں ایک مرتبہ مقررہ وقت پر ۱۵x۸ اور ۱۵x۱۲ کے درمیان نصب گدلے شیشوں پر چسپاں پھٹے ہوئے خاکی کاغذوں میں سے میری طرف کنکھیوں سے دیکھتا ہے۔ میں اسے دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھنے کا بہانہ کرتا ہوں۔ مجھے گھورنا ناپسند ہے یہ دوسرے کو اس کی داخلیت سے محروم کر کے اپنے آپ کو مسلط کرنا ہے' وہ دن میں دو مرتبہ چند فائلیں اٹھا کر لاتا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہیں جن

میں غنودگی تیر رہی ہے: یار تم رات سوئے نہیں؟: مجھے نیند نہیں آتی۔ کیوں؟ پتہ نہیں۔ شادی شدہ ہو' نہیں ارادہ ہے؟ نہیں' کس کے پاس رہتے ہو؟ ماں اور بھائی کے پاس۔

"تمہیں یہ زندگی پسند ہے؟" اس نے مجھے گھور کر دیکھا ہے لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

"سر یہ آج کی ڈاک ہے۔" اس نے ایک پلندہ میری میز پر رکھ دیا ہے۔

"تم زندگی سے خوش ہو؟" میں نے پھر اصرار کیا ہے۔

"سر ایسی زندگی سے تو بہتر تو گاڑی کے نیچے آجانا ہے" وہ یہ کہہ کر کانپتا ہوا تیزی سے ۱۵x۱۸ میں چلا گیا ہے۔ میں گدلے شیشوں میں سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا ہے اور اپنی کنپٹیوں کو ہاتھوں سے دبا رہا ہے۔ اس کے ماتحت اہلکار حسب معمول نشستوں سے غائب ہیں۔ وہ کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ لیکن اس کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی ہے۔ میں معمول کے مطابق نہایت میکانکی طریقے سے ڈاک پر اپنے دستخط ثبت کرتا جا رہا ہوں۔ میں نے خلاف معمول آج تیسری مرتبہ اسے گدلے شیشوں میں سے جھانکا ہے وہ باہر آئے ہوئے اہلکار سے کاغذ وصول کر کے دستخط کر رہا ہے۔ اہلکار چلا گیا ہے۔ وہ پھر اکیلا ہے اور ایک کاغذ کو غور سے پڑھ رہا ہے۔ وہ ایک دم اپنی کرسی سے اٹھ کر بھاگ کر ۱۵x۸ میں آنا چاہتا ہے لیکن راستے میں رکھی ہوئی کرسیوں سے دو مرتبہ ٹکرایا ہے اور میرے پاس کھڑا بری طرح ہانپ رہا ہے۔ اس کا چہرہ تمازت سے سرخ ہے' میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا ہے' اس کے مہین ہونٹ کپکپائے ہیں لیکن آواز حلق میں پھنس گئی ہے۔ اس نے بے بسی اور خوف سے میری طرف کاغذ بڑھایا ہے۔ اس نے پھر کچھ کہنا چاہا ہے لیکن آواز لفظ بنتے بنتے اٹک جاتی ہے

"ادھر لاؤ میں پڑھتا ہوں۔ یہ تو کوئی آفس آرڈر ہے۔" (میں نے کاغذ پر سرسری نظر ڈال کر بغیر پڑھے اسے میز پر پھینک دیا ہے۔)

"سر' یہ بے حد ضروری ہے۔" اس نے ایک دم اپنی کھوئی ہوئی آواز حاصل کی ہے "یہ بہت زیادتی ہے اس عمارت میں سب صحت مند ہیں' میں زبردستی طبی معائنہ نہیں کراؤں گا۔"

"مت کراؤ' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ہے۔ وہ جو نہیں کرائے گا اسے برخاست کر دیا جائے گا۔ لکھا ہے کہ یہ بیماری خفیہ طریقے سے پھیلتی ہے اگر کسی کو اپنے بدن پر یا دوسرے کے بدن پر سفید دھبہ نظر آئے تو فوراً اس کی اطلاع دی جائے سر۔

"یہ مضحکہ خیز ہے۔ میں اپنا ایکسرے نہیں کراؤں گا۔ میرا سینہ شفاف ہے---------- اس زمانے میں یہ بیماری نہیں پھیل سکتی' یہ حفظان صحت کی آڑ میں----------" میں بدستور مسکرا رہا ہوں: اچھا بابا میں تمہارے ساتھ ہوں دیکھا جائے گا۔"

": نو سر' کوئی کسی کے ساتھ نہیں ہو سکتا---------- پیدائش اور موت---------- سر میری صحت میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ ہر کوئی بیمار ہو سکتا ہے۔ لیکن ہر بیماری وبا نہیں ہو سکتی۔ بیماری کی تشخیص اس کا علاج نہیں' یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ کل سب نے ۱۲ بجے دوپہر چیف میڈیکل آفیسر کے سامنے پیش ہونا ہے۔ سر مجھے سات دن کی فوری رخصت چاہئے۔ آٹھویں دن میں آجاؤں گا۔"

- اس کے ہونٹوں کے دونوں گوشے جھاگ سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس کا سانس اکھڑا ہوا ہے۔ سارا لباس پسینے سے تر اور چہرہ ہلدی کی طرح زرد' میں نے اس کے ماتھے کو چھوا ہے جو توے کی طرح گرم ہے میں نے گھنٹی بجا کر اردلی کو بلایا

ہے: انہیں گھر لے جاؤ۔ آپ درخواست بھجوا دیں----------

آج آٹھواں دن ہے اور ابھی تک اس کی درخواست نہیں آئی ہے۔ مجھے اس کے بارے میں تشویش ہے میرا طبی معائنہ بھی ہو چکا ہے۔ ابھی تک طبی معائنوں کے نتائج کسی کو نہیں بتائے گئے۔ میرے ہمنام کے بارے میں متعدد مرتبہ پوچھا گیا ہے میں نے انہیں مطلع کر دیا ہے کہ وہ چھٹی پر ہے۔

آج میں خود تین دنوں کے بعد دفتر آیا ہوں۔ دفتر کی میکانکی زندگی سے بچنے کے لئے میں تین دن تک گھر میں چھپا رہا' میری میز پر کاغذوں کے انبار لگ چکے ہیں۔ میں نے ۱۵x۱۲ اور ۱۵x۸ کے درمیان نصب گدلے شیشوں سے جھانکا ہے۔ حسب معمول سب کام میں مصروف ہیں۔ میرے ہم نام کی نشست پر ایک گمنام شخص کام میں منہمک ہے میں نے سٹینو کو بلایا ہے۔ وہ ابھی تک چھٹی سے واپس نہیں آیا؟ اس نے جواب نہیں دیا ۱۵x۱۲ میں کام کرنے والوں کے چہرے گدلے شیشوں کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں۔ سب کے ہونٹ اور ناک چپٹے اور آنکھوں کے گول دائرے مجھ پر مرکوز ہیں۔ وہ ابھی تک نہیں آیا؟ میں نے پھر اصرار کیا ہے سٹینو گرافر نے جواب دینے کی بجائے ایک لفافہ میری طرف بڑھایا ہے۔ پھر چھٹی بھیج دی؟ نہیں سر وہ اب نہیں ہے۔ یہ لفافہ مرحوم کے بھائی نے بھیجا ہے کہ حسب وصیت آپ تک پہنچا دیا جائے۔

آج آٹھواں دن ہے اور میں دفتر نہیں گیا ہوں۔ میں سینکڑوں مرتبہ محدب شیشے کے نیچے اپنے بائیں ہاتھ کی پشت پر پھیلتے ہوئے سفید دھبے کا معائنہ کر چکا ہوں۔ لیکن ابھی تک یہ جان نہیں سکا کہ یہ سفید دھبہ اندھیرے میں ساری جلد میں چاروں طرف پھیل گیا ہے جو روشنی میں سکڑ جاتا ہے۔ آٹھویں دن وہ اس کا معائنہ کریں گے۔ نہیں ہرگز نہیں' وہ اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکیں گے وہ مجھے ٹیسٹ کیس بنا کر اپنا علم ثابت کر کے اگلے گریڈ میں ترقی چاہتے ہیں ان کی تشخیص

مجھے شہر بدر کر دے گی۔ میں پہلے سے بھی زیادہ تنہا ہو جاؤں گا۔ میری بوڑھی ماں میری بیماری کے خوف سے اپنی بہن کے گھر چلی گئی ہے۔ میرا بھائی اور اس کے بیوی بچے اپنے کمروں میں دوائیں چھڑک کر کسی اور جگہ چلے گئے ہیں۔ ابھی محلے میں کسی اور کو میری بیماری کا پتہ نہیں چلا۔ کہرام مچ جائے گا۔ میرا سر چکرانے لگا ہے سفید دھبہ پھیلتا پھیلتا دماغ تک جا پہنچا ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں کو مت داغو' میں کسی کو چھوؤں گا نہیں' میں دستانیں پہن کر اپنی فائلیں اس کے پاس لے کر جاؤں گا۔ میری میز پر کاغذوں کا ڈھیر بڑھتا جا رہا ہے۔ اوہ میرے مکان کے باہر تمام خطوں سے ہنگامی سائرن بجاتی ہوئیں ایمبولینس گاڑیاں رک گئی ہیں۔ بے شک میری علالت کی نشاندہی ہو چکی ہے وہ میرے دماغ کی سکریننگ کریں گے ہر ایک مسام میں سوئیوں سے کچوکے دیں گے۔ میرے اعضاء رئیسہ کی Bioscopy کریں گے' وہ پھر بھی اس کو جڑ کو نہیں پا سکیں گے۔ انہیں صرف میرے بارے میں شبہ ہے یہ بیماری اس عمارت کے اندر اور باہر سرائیت کر چکی ہے۔ وہ پیش بندی کرنا چاہتے ہیں۔ میں جلدی میں ہوں' یہ سوال و جواب کا وقت نہیں ہے۔ صرف یہ کہ میں خود ایک سوال ہوں جس میں وہ بھی شامل ہیں جنہوں نے مجھے پیدا کیا اور پھر میرے ساتھ مکالمہ کرنے سے گریز کر گئے۔ میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر سوچ رہا ہوں۔ دفتر کا ایک اسسٹنٹ ایک ترقی یافتہ کلرک ہوں۔ مجھے بڑبڑ کرنے کی عادت ہے میرا وجود ایک مکالمہ ہے ایک ادھورا لفظ ہے۔ وہ میری خواہشوں اور امنگوں کو دفتر کی میز پر رکھ کر بھول گئے' میں نے صبر کے ذریعے لذتوں سے آزادی حاصل کی۔ میرا وقت قریب آ چکا ہے۔ میری موت میرے لئے ایک اٹل حقیقت ہے جو دوسروں کے لئے ایک تمثیل بن جائے گی۔ Who کے تمام سپشلسٹوں کو ان کے سرد ممالک میں واپس بھیج دینا چاہیے اور یہاں کے سپشلسٹ میری فیس سے محروم رہیں گے اوہ خدایا' میں نے تیری

عبادت کی لیکن زمانے نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔۔۔

آج آٹھواں دن ہے' مجھے دفتر جانا ہے' میں اب بدن نہیں کھجلاؤں گا۔ میرے کپڑے اس زمانے کے ضمیر کی طرح تار تار ہو چکے ہیں۔ اپنا اوپر کا ہونٹ ڈھانپ لیا ہے مجھے اس شہر سے باہر مت پھینکو' یہ دھبہ موسیٰ کی زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ جلد میں ہمیشہ کیلشیم کیکمی رہی ہے۔ میں نے ابھی ابرو اور سر کے بال منڈھوا دیتا ہوں۔ اہل شہر تم ایک پرندے کو ذبح کر کے اس کا خون برتن میں جمع کرو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نہیں یہ دھبہ میری روشنی ہے جو اندھیرے کو مجھ سے جدا کرتی ہے لیکن یہ روشنی راستہ نہیں دکھاتی کہ میں ایک ترقی یافتہ کلرک ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۷ بجے شام کا وقت بے محابا آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ دھبہ اپنی جگہ سے کھسکتا ہوا ساری جلد کو ڈھانپ چکا ہے۔ میرے کپڑوں سے بو آنے لگی ہے' میں آٹھواں دن نہیں دیکھوں گا۔ رو کو رو کو زمین کانپ رہی ہے ابھی سٹیشن نہیں آیا۔ میرے اعصاب پر ۱۸ پشاور ایکسپریس چل رہی ہے' ۸ بجے رات۔ میرا وقت آگیا ہے۔ سارے شہر کی کھیاں میرے سفید بدن کے سواگت کے لئے باہر بھنبھنا رہی ہیں۔

آج تک
انیس ناگی کے ۱۰۰ تنقیدی مضامین
انیس ناگی
ہمہ جہت نقاد ہے جو خطرناک حد تک بیباک ہے۔
اس نے اردو تنقید کو بین الاقوامی تنقید کا ہمرکاب بنایا ہے۔
نظریہ سازی، جارحیت اور وضاحت نے اُسے اردو تنقید میں بڑا مقام دیا ہے۔
ڈاکٹر تبسم کاشمیری
Scanned with CamScanner